# تدبرِ قرآن

## مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# مقدّمہ

## حامداً ومصلیاً

اس کتاب پر میں کوئی مقدمہ لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اب سے بہت پہلے میں نے 'تدبر قرآن' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس کے غالباً دو تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ یہ کتاب میں نے اسی مقصد کے لیے لکھی تھی کہ یہ میری تفسیر کے لیے مقدمے کا کام دے گی۔ چنانچہ ارادہ یہی تھا کہ اسی کو تفسیر کے شروع میں لگا دیا جائے گا لیکن اب جب اس نگاہ سے اس کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ بہت پہلے لکھے جانے کی وجہ سے اس میں بعض کمیاں بھی رہ گئی ہیں اور اس کے بعض مقامات میں غیر ضروری طوالت بھی ہے۔ اگر اسی کو بعینہٖ کتاب کے ساتھ جوڑ دیا گیا تو یہ اس کتاب کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ چنانچہ دوسرے ضروری کاموں کو نظر انداز کر کے مجھے اس مقدمے کے لیے قلم سنبھالنا پڑا۔ وبید اللہ التوفیق۔

## ۱۔ اس تفسیر کا مقصد اور فہم قرآن کے وسائل

اس کتاب کے لکھنے سے میرے پیش نظر قرآن حکیم کی ایک ایسی تفسیر لکھنا ہے جس میں میری دلی آرزو اور پوری کوشش اس امر کے لیے ہے کہ میں ہر قسم کے بیرونی لوث اور لگاؤ اور ہر قسم کے تعصب و تحزب سے آزاد اور پاک ہو کر ہر آیت کا وہ مطلب سمجھوں اور سمجھاؤں جو فی الواقع اور فی الحقیقت اس آیت سے نکلتا ہے۔ اس مقصد کے تقاضے سے قدرتی طور پر میں نے اس میں فہم قرآن کے ان وسائل و ذرائع کو اصل اہمیت دی ہے جو خود قرآن کے اندر موجود ہیں۔ مثلاً قرآن کی زبان، قرآن کا نظم اور قرآن کے نظائر و شواہد، دوسرے وسائل جو قرآن سے باہر کے ہیں۔ مثلاً حدیث، تاریخ، سابق آسمانی صحیفے اور تفسیر کی کتابیں ___ اگرچہ اپنے امکان کے حد تک میں نے ان سے بھی فائدہ اٹھایا ہے لیکن ان کو داخلی وسائل کے تابع رکھ کر ان سے استفادہ کیا ہے۔ جو بات قرآن کے الفاظ، قرآن

کے نظم اور قرآن کی خود اپنی شہادتوں اور نظائر سے واضح ہوگئی ہے وہ میں نے لے لی ہے۔ اگر کوئی چیز اس کے خلاف میرے سامنے آئی ہے تو میں نے اس کی قدروقیمت اور اہمیت کے اعتبار سے اس کو جانچا ہے۔ اگر دینی و علمی پہلو سے وہ کوئی اہمیت رکھنے والی بات ہوئی ہے تو میں نے اس پر تنقید کر کے اس کو سمجھنے اور اس کے صحیح پہلو کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور اگر بات کچھ یوں ہی سی ہوئی ہے تو اس کو نظرانداز کر دیا ہے۔ بے ضرورت اس پر طبع آزمائی نہیں کی ہے۔

## ۲۔ فہم قرآن کے داخلی وسائل

اب اختصار کے ساتھ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مذکورہ دونوں قسم کے وسائل سے میں نے اس کتاب میں کس کس طرح فائدہ اٹھایا ہے۔ پہلے داخلی وسائل سے متعلق کچھ باتیں عرض کرتا ہوں۔

### قرآن کی زبان:

قرآن کی زبان عربی ہے اور عربی بھی وہ عربی جو فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزے کی حد کو پہنچی ہوئی ہے۔ جن و بشر میں سے کسی کو یہ قدرت حاصل نہیں ہے کہ اس کے مثل کلام پیش کر سکے۔ شعرائے سبعہ معلقہ میں لبید آخری شاعر ہیں۔ ان کے ایک شعر پر سوق عکاظ میں تمام شعرائے وقت نے ان کو سجدہ کیا اور عرب کی روایت کے مطابق اعزاز کے طور پر ان کا قصیدہ خانہ کعبہ پر آویزاں کیا گیا۔ یہ لبید بعد میں مسلمان ہو گئے۔ مسلمان ہونے کے بعد انھوں نے شعر کہنا ترک کر دیا۔ جو شاعر تمام عرب شعرا کا مسجود، وقت کا ملک الشعرا اور عرب کی فصاحت و بلاغت کا مظہر کامل ہو، اس کے یوں ترک شعر پر لوگوں کو بڑا تعجب ہوا۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ اب آپ شعر نہیں کہتے؟ اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ اَبَعْدَ الْقُرْآن؟ کیا قرآن کے نازل ہو جانے کے بعد بھی اس کے لیے کوئی گنجائش باقی رہ گئی ہے۔

قرآن کے اعجاز بلاغت کے آگے سرافگندگی و سپر اندازی کا یہ اظہار و اعتراف اس عظیم شاعر کی طرف سے ہے جو اپنے زمانے میں، جیسا کہ گزرا، عرب کی تمام فصاحت و بلاغت کا نشان و علم تھا۔ جب وہ اس طرح قرآن کے آگے سربسجود ہو گیا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ عرب کی تمام فصاحت و بلاغت نے قرآن کی فصاحت و بلاغت کے آگے گھٹنے ٹیک دیے اس کے بعد کسی اور کے لیے قرآن کے آگے نگاہیں اونچی کرنے کا کیا امکان باقی رہا؟

اس درجے و مرتبے کے کلام کے زور و اثر اور اس کی خوبیوں اور لطافتوں کا اگر کوئی شخص اندازہ کرنا چاہے تو یہ کام، ظاہر ہے کہ وہ اس کے ترجموں، اس کی تفسیر اور اس کے لغتوں کے ذریعے سے نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کے لیے اس کو اس زبان کا ذوق پیدا کرنا پڑے گا، جس میں وہ کلام ہے۔ کسی زبان کا ذوق پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے فطری رجحان طبیعت اور لطافت ذوق کے ساتھ ساتھ اس زبان کی مشق و مارست ناگزیر ہے۔ برسوں کی محنت و مزاولت کے بعد کہیں آدمی میں کسی زبان کا ذوق پیدا ہوتا ہے اور اگر زبان

اپنی مادری زبان نہ ہو تو یہ مشکل دو چند اور سہ چند ہو جاتی ہے۔

عربی زبان بالخصوص قرآن کی زبان کے معاملے میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ اس وقت وہ زبان کہیں بھی رائج نہیں ہے جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ عرب اور عجم دونوں ہی میں اس وقت جو عربی پڑھی پڑھائی اور لکھی بولی جاتی ہے وہ اپنے اسلوب و انداز، اپنے لب و لہجہ اور اپنے الفاظ و محاورات میں اس زبان سے بہت مختلف ہے جس میں قرآن ہے۔ ہمارے اپنے عربی مدرسوں میں جو عربی پڑھی پڑھائی جاتی ہے وہ قلیوبی، نفحۃ الیمن یا زیادہ سے زیادہ حریری و متنبی کے قسم کی عربی ہے۔ عرب، شام اور مصر میں جو عربی رائج و مقبول ہے اس کا اندازہ ان ممالک کے رسائل و اخبارات سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ زبان عربی ضرور ہے، لیکن قرآن کی زبان سے یہ اتنی مختلف ہے کہ اس کا ذوق نہ صرف یہ کہ قرآن کی زبان کا کوئی ذوق نہیں پیدا کرتا بلکہ قرآن سے بیگانہ کرتا ہے۔

قرآن مجید جس زبان میں اترا ہے وہ نہ تو حریری و متنبی کی زبان ہے، نہ مصر و شام کے اخبارات و رسائل کی، بلکہ وہ اس ٹکسالی زبان میں ہے جو امرء القیس، عمرو بن کلثوم، زہیر اور لبید جیسے شعراء اور قس بن ساعدہ جیسے بلند پایہ خطیبوں کے ہاں ملتی ہے۔ اس وجہ سے جو شخص قرآن کی زبان کے ایجاز و اعجاز کا اندازہ کرنا چاہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دور جاہلیت کے شعرا و ادبا کے کلام کے محاسن و معایب کے سمجھنے کا ذوق پیدا کرے۔ اس کے بغیر کوئی شخص نہ تو یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ قرآن عربی زبان کے محاسن کا کیسا کامل نمونہ ہے اور نہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کے اندر وہ کیا سحر ہے جس نے تمام فصیحوں اور بلیغوں کو جیتے جی عاجز و درماندہ کر دیا۔

اگرچہ اس بات میں شبہ نہیں ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے شاعروں اور خطیبوں کے کلام کا بڑا حصہ دست بُردِ زمانہ کی نذر ہو گیا لیکن پھر بھی اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ اصل مقصد کے لیے کفایت کرتا ہے۔ پچھلے پچاس سال میں بہت سے ایسے دواوین شائع ہو چکے ہیں جو پہلے ناپید تھے۔ شعرا کے کلام کے ایسے مجموعے بھی اب دستیاب ہیں جن میں کلام عرب کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اگرچہ ان کے اندر منحول کلام بھی شامل ہے لیکن عربیت کا ذوق رکھنے والے آسانی سے ان کے خالص اور منحول میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ خطبائے جاہلیت کے جواہر ریزوں کے لیے پہلے جاحظ، مبرد اور ابن حدید وغیرہ کی کتابوں کی خوشہ چینی کرنی پڑتی تھی اب یہ خطبات الگ کر کے شائع کر دیے گئے ہیں۔ غرض طالب اور قدردان کے لیے تربیتِ ذوق کا کافی سامان موجود ہے، ضرورت ہمت اور شوق کی ہے۔

اس تمام دراز نفسی کو اس مفہوم میں نہ لیجیے کہ میں اس امر کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ میرے اندر یہ ذوق موجود ہے۔ میرا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ قرآن کی زبان کی نوعیت کیا ہے اور اس کے ادبی محاسن کو جانچنے اور تولنے کے لیے کسوٹی اور معیار کیا ہے۔ میں اس سلسلے میں جو کچھ کر سکا ہوں وہ صرف اس قدر ہے کہ میں نے اس تفسیر کے لیے قلم اٹھانے سے پہلے ادب جاہلی کے اس تمام ذخیرے کو اچھی طرح پڑھ لیا ہے جو مجھے دستیاب ہو سکا ہے اور جو قرآن کی کسی ادبی، نحوی اور معنوی مشکل کے حل کرنے میں کسی پہلو سے مددگار ہو سکتا ہے۔ میں بے تکلف یہ بات بھی اس موقع پر ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ جو کچھ بھی میں نے کیا ہے اس میں زیادہ دخل مجھے نہیں بلکہ میرے استاذ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ ہے۔

انھوں نے اس طرح کی ساری چیزیں پڑھ کر قرآن کی تفسیر میں کام آنے والی ہر چیز کو نشان زد کر دیا تھا۔ میرا کارنامہ صرف اس قدر ہے کہ میں نے ان چیزوں کو اچھی طرح ہضم کر لیا ہے اور قرآن کی مشکلات حل کرنے، اس کے اسالیب و محاورات کو جانچنے اور اس کی لطافتوں اور نزاکتوں کو پرکھنے میں ان سے فائدہ اٹھایا ہے۔

صرف زبان واسلوب ہی کے معاملے میں نہیں بلکہ اہل عرب کے معروف و منکر، ان کی معاشرتی زندگی کی خصوصیات، ان کی سوسائٹی میں خیر وشر کے معیارات، ان کے سماجی، تمدنی اور سیاسی نظریات، روزمرہ کی زندگی میں ان کی دلچسپیاں اور مشاغل، ان کے مذہبی رسوم و معتقدات، غرض اس طرح کی ساری چیزوں کے سمجھنے میں جو مدد ان کے لٹریچر سے ملتی ہے، وہ کسی دوسری چیز سے نہیں ملتی۔ ان چیزوں سے صحیح واقفیت اس شخص کے لیے نہایت ضروری ہے جو قرآن کے اشارات و تلمیحات اور اس کی تعریضات و کنایات کو اچھی طرح سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا چاہتا ہو۔ قرآن نے اس طرح کی ساری ہی چیزوں سے تعرض کر کے ان کے اندر جو خیر تھا اس کو اجاگر کیا ہے جو شر تھا اس کو مٹایا ہے، اس وجہ سے اثنائے کلام میں ایسے اشارے اور کنائے بار بار آتے ہیں جن کی پوری وضاحت اس وقت تک مشکل ہے جب تک اسلام کی اصلاحات کے ساتھ ساتھ آدمی جاہلیت کی بدعات سے بھی واقف نہ ہو۔ مسئلے کو واضح کرنے کے لیے بعض مثالیں پیش کرنا مناسب ہوتا لیکن تفسیر میں جگہ جگہ اس کی مثالیں آئیں گی اس وجہ سے یہاں صرف اشارے پر اکتفا کرتا ہوں۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ عرب جاہلیت کے متعلق ہماری تاریخ کی کتابوں میں جو مواد ملتا ہے وہ زیادہ تر سطحی اور سرسری معلومات پر مبنی ہے۔ اس سے ان چیزوں کے باب میں کچھ زیادہ رہنمائی نہیں ملتی جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ عام طور پر ہمارے مورخوں نے اہل عرب کی جو تصویر کھینچی ہے وہ کسی انسانی معاشرے کی نہیں بلکہ ڈھوروں ڈنگروں کے کسی گلے کی ہے۔ اس کو دیکھ کر یہ گمان بھی نہیں گزرتا کہ یہ اس قوم کی تصویر ہے جو کبھی ملت ابراہیمؑ اور دین اسماعیلؑ کی وارث رہی ہے۔ ایسا انھوں نے اس خواہش کے تحت کیا ہے کہ اس کے بغیر ان کے نزدیک اسلام کا اعجاز نمایاں نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے خیال میں اسلام کا اعجاز یہ ہے کہ اس نے ڈھوروں ڈنگروں کا ایک گلہ لیا اور تمام عالم پر اس کا پلہ بھاری کر دیا۔ اس بات کا ایک پہلو اگرچہ صحیح ہے لیکن اس میں ایک دوسرا پہلو نظر انداز ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ اگر عرب فی الواقع ایسے ہی ڈھور ڈنگر ہوتے تو وہ قرآن جیسی کتاب کے حامل کیسے بن سکتے؟ میرے سامنے چونکہ ابتدا ہی سے یہ سوال رہا ہے اس وجہ سے مجھے تاریخ کی کتابوں سے قطع نظر کر کے عرب جاہلیت کے لٹریچر میں ان کی تصویر کا حسن و قبح دونوں دیکھنے کی کوشش کرنی پڑی اور اس کوشش سے میری معلومات میں جو اضافہ ہوا میں نے اس تفسیر میں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ میں نے زبان کے مسئلے کو محدود مفہوم میں نہیں بلکہ نہایت وسیع مفہوم میں لیا ہے۔ اصل شے جو قرآن کے سمجھنے میں کار آمد ہے وہ اس زبان وادب کا اعلیٰ مذاق ہے جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ جس میں یہ مذاق نہ ہو وہ محض لغت کی ورق گردانی سے قرآن کے محاسن کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ لوگ

مجھ سے اکثر سوال کرتے رہتے ہیں کہ قرآن کی مشکلات حل کرنے میں کس لغت پر وہ اعتماد کریں؛ اس سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ یہ گمان رکھتے ہیں کہ اگر ان کو کوئی حسب منشا لغت مل گیا تو قرآن کی مشکلات کے لیے ان کو کلید ہاتھ آجائے گی حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ زبان کا مذاق رکھنے والے کے لیے تو لغت بے شک ایک کار آمد چیز ہے لیکن جس میں یہ مذاق پیدا نہیں ہوا ہے، اس کے لیے لغت ایک بے سود شے ہے میں نے جس لغت سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے وہ لسان العرب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحب لسان، استعمالات اور شواہد و نظائر کے ذریعہ سے اکثر لفظ کے مختلف پہلو واضح کر دیتے ہیں۔ یہ چیز بہت مفید ہے۔ میرے نزدیک لسان کی اہمیت اسی پہلو سے ہے اور اسی مقصد کے لیے اس کی مراجعت کرنی چاہیئے۔ بعض اوقات قرآن کے کسی لفظ کے تحت اہل تاویل کے اقوال جو وہ نقل کر دیتے ہیں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن عام لوگ اسی کو بڑی تحقیق سمجھتے ہیں۔ امام راغب کی مفردات کو بعض لوگ بڑا درجہ دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے تو فی الواقع اس کا بڑا درجہ ہے کہ وہ خالص قرآن کا لغت ہے لیکن حل مشکلات کے سلسلے میں جب کبھی میں نے اس کی مراجعت کی تو مجھے اس سے مایوسی ہی ہوئی۔

## نظم:

نظم کلام کسی کلام کا ایسا جزو لاینفک ہوتا ہے کہ اس کے بغیر کسی عمدہ کلام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ قرآن جس کو فصاحت و بلاغت کا معجزہ قرار دیا جاتا ہے اور جو فی الواقع معجزہ ہے بھی، ایک بہت بڑے گروہ کے نزدیک نظم سے بالکل خالی کتاب ہے۔ ان کے نزدیک نہ ایک سورہ کا دوسری سورہ سے کوئی ربط و تعلق ہے، نہ ایک سورہ کی مختلف آیات ہی میں باہم کوئی مناسبت و موافقت ہے۔ بس مختلف آیات، مختلف سورتوں میں بغیر کسی مناسبت کے جمع کر دی گئی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایسا فضول خیال ایک ایسی عظیم کتاب کے متعلق لوگوں کے اندر کس طرح جاگزیں ہو گیا ہے جس کے متعلق دوست دشمن دونوں ہی کو اعتراف ہے کہ اس نے دنیا میں ہل چل پیدا کر دی، اذہان و قلوب بدل ڈالے، فکر و عمل کی نئی بنیادیں استوار کیں اور انسانیت کو ایک نیا جلوہ دیا۔

اگر فی الواقع قرآن میں کوئی نظم و ترتیب نہیں ہے تو پھر تو بہترین ترتیب نزولی ہوتی۔ جس ترتیب سے آیتیں نازل ہوئی تھیں اسی ترتیب کے ساتھ مصحف میں جمع کر دی جاتیں لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ مصحف کی ترتیب نزولی نہیں ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص ہدایات کے تحت خاص خاص آیات کے لیے خاص خاص مواقع متعین کیے گئے ہیں۔ دوسری مناسب ترتیب مقداری ہو سکتی تھی یعنی آیتیں برابر برابر کی مقدار میں مختلف سورتوں میں جمع کر دی جاتیں لیکن ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ یہ صورت بھی نہیں ہے بلکہ سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی اور کتنی ہی چھوٹی سورتیں ہیں جو اپنی سے بڑی سورتوں پر مقدم ہیں۔ یہ سورتوں کی حد بندی بھی اس صورت میں کچھ غیر ضروری سی ہو کر رہ جاتی ہے اس لیے کہ حفاظ کی سہولت کے لیے تو یہ پاروں کی حد بندی کافی تھی لیکن ہر صاحب علم کو معلوم ہے کہ سورتوں کی حد بندی اور ان کی ترتیب تمام تر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے تحت عمل میں آئی ہے درآنحالیکہ پاروں

کی تقسیم بہت بعد کی چیز ہے۔

اس خیال کی انھی کمزوریوں کی وجہ سے شروع ہی سے ہمارے ہاں علما کا ایک ایسا گروہ بھی رہا ہے جو قرآن میں نظم کا بڑی شدت سے قائل رہا ہے اور اس گروہ کے بعض اکابر نے اس موضوع پر کتابیں بھی لکھی ہیں۔ علامہ سیوطیؒ "اتقان" میں لکھتے ہیں۔

"علامہ ابوجعفر بن زبیر، شیخ ابوحیان نے نظم قرآن پر ایک خاص کتاب لکھی اور اس کا نام "البرھان فی مناسبۃ ترتیب سور القرآن" رکھا، اور ہمارے ہم عصروں میں سے شیخ برہان الدین بقاعی کی تفسیر "نظم الدرر فی تناسب الآی والسور" بھی اسی اصول پر لکھی گئی ہے۔"

علامہ سیوطیؒ نے خود اپنی ایک کتاب کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں انھوں نے نظمِ قرآن کے علاوہ قرآن کے معجزہ ہونے کے پہلو بھی واضح کیے ہیں۔ اسی سلسلے میں نظمِ قرآن کی اہمیت کا اعتراف وہ ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

"ترتیب اور نظم کا علم ایک نہایت اعلیٰ علم ہے لیکن اس کے مشکل ہونے کے سبب سے مفسرین نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ امام فخرالدین کو اس چیز کا سب سے زیادہ اہتمام رہا ہے۔ ان کا قول یہ ہے کہ حکمت قرآن کا اصلی خزانہ اس کے نظم و ترتیب ہی میں چھپا ہوا ہے۔"

امام رازیؒ اپنی تفسیر میں آیت وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَمِيًّا لَّقَالُوا الآیہ (حٰمٓ السجدہ) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے جواب میں اتری ہے جو ازراہِ شرارت یہ کہتے تھے کہ اگر قرآن مجید کسی عجمی زبان میں اتارا جاتا تو بہتر ہوتا۔ لیکن اس طرح کی باتیں کہنا میرے نزدیک کتابِ الٰہی پر سخت ظلم ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن کی آیتوں میں باہدگر کوئی ربط و تعلق ہی نہیں ہے۔ حالانکہ یہ کہنا قرآن حکیم پر بہت بڑا اعتراض کرنا ہے۔ ایسی صورت میں قرآن کو معجز ماننا تو الگ رہا اس کو ایک مرتب کتاب کہنا بھی مشکل ہے۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہ سورہ شروع سے لے کر آخر تک ایک مربوط کلام ہے (اس کے بعد تقریباً اٹھارہ سطروں میں سورہ کی اجمالی تفسیر اور اس کا نظم بیان کر کے فرماتے ہیں کہ) ہر منصف جو حق پسند ہے تسلیم کرے گا کہ اگر سورہ کی تفسیر اس طرح کی جائے جس طرح ہم نے کی ہے تو پوری سورت ایک ہی مضمون کی حامل نظر آئے گی اور اس کی تمام آیتیں ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کریں گی۔"

اسی سلسلہ کی ایک نہایت اہم شخصیت علامہ مخدوم مہائمیؒ بھی ہیں۔ ان کی تفسیر "تبصیر الرحمان و تیسیر المنان" تفسیر مہائمی کے نام سے نہایت مشہور ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے ذوق کے مطابق آیات کا نظم بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسی مسلک کے علم بردار ایک عالم علامہ ولی الدین ملویؒ ہیں۔ نظمِ قرآن سے متعلق ان کا ارشاد یہ ہے۔

"جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ قرآن مجید کا نزول چونکہ حالات کے تقاضوں کے تحت تھوڑا تھوڑا کر کے ہوا ہے اس وجہ سے اس میں نظم نہیں تلاش کرنا چاہیے، ان کو دھوکا ہوا ہے۔ قرآن مجید کا نزول بلاشبہ حسب حالات حسبۃ

جستہ ہوا ہے لیکن اس کی ترتیب میں نہایت گہری حکمت ملحوظ ہے۔"

اس تفصیل سے یہ امر واضح ہے کہ نظم قرآن سے متعلق ایک گروہ میں اگر غلط خیال موجود رہا ہے تو شروع ہی سے ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جس کا نظریہ بالکل صحیح ہے اور اس نے اپنے نظریے کے مطابق کتاب الٰہی کی خدمت کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جو لوگ نظم کے منکر ہوئے ہیں وہ اس وجہ سے نہیں منکر ہوئے ہیں کہ ان کے پاس انکار نظم کی کوئی دلیل موجود تھی یا وہ بے نظمی ہی کو کلام کا کوئی ہنر سمجھتے تھے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہیں قرآن مجید میں جگہ جگہ بے نظمی محسوس ہوئی اور وہ اس کا کوئی حل نہ پا سکے تو جو کمزور سے کمزور آڑ بھی انھیں ملی اسی میں انھوں نے پناہ لے لی۔

اگرچہ ان کے لیے صحیح روش تو یہی تھی کہ یہ قرآن کو متہم کرنے کے بجائے سارا الزام اپنی کوتاہیٔ ہمت پر لیتے لیکن انصاف کیجیے تو دو باتیں ان کے حق میں بھی جاتی ہیں جن کے سبب سے ان کو معذور قرار دینا پڑتا ہے۔ ایک تو یہ کہ نظم قرآن کی تلاش ہے ہی ایسا کام کہ ہر شخص اس کو کنی کے لیے اپنی زندگی وقف نہیں کر سکتا۔ دوسری یہ کہ جن لوگوں نے قرآن میں نظم کا دعویٰ کیا، ان کی خدمات کے اعتراف کے باوجود، یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں پیش کر سکے جو اس راہ میں قسمت آزمائی کرنے والوں کا حوصلہ بڑھاتی۔ اوپر جن بزرگ مصنفوں کے اقوال و ارشادات نقل ہوئے ہیں ان میں سے تین بزرگوں کی کتابوں سے استفادے کا موقع مجھے نصیب ہوا ہے۔ میں بلاکسی ارادۂ تحقیر کے عرض کرتا ہوں کہ ان میں سے کسی کی کتاب سے بھی مجھے کسی مشکل کے حل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملی۔ مہائمیؒ اور رازیؒ کی تفسیریں عرصے تک میرے مطالعے میں رہی ہیں۔ بلکہ رازیؒ کی تفسیر تو اب بھی پیش نظر رہتی ہے۔ یہ حضرات جس قسم کا نظم بیان کرتے ہیں اس کے متعلق یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ اس قسم کا نظم ہر دو غیر متعلق چیزوں میں جوڑا جا سکتا ہے۔

اصل ضرورت اس چیز کی تھی کہ لوگوں کے سامنے کوئی ایسی چیز آتی جو قرآن کے نظم کو اس طرح واضح کر دیتی کہ ہر صاف ذہن قاری کو وہ اپنے دل کی آواز معلوم ہونے لگتی، لیکن اس طرح کی کوئی چیز نہ صرف یہ کہ لوگوں کے سامنے آئی نہیں بلکہ جو چیزیں آئیں وہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، مایوس کن ثابت ہوئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے نظم کی تلاش کو "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کا مصداق سمجھ لیا۔

اس راہ میں سب سے پہلی کامیاب کوشش کی سعادت میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہیؒ کو حاصل ہوئی۔ مولانا نے بے شک اس کے حق میں نہایت مؤثر و دل نشین دلائل بھی دیے اور متعدد سورتوں کی تفسیر بھی انھوں نے لکھی جن کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ہر سورہ نہایت حسین نظم کا نہایت دل آویز پیکر ہے۔ نظم کے دلائل پر مولانا کا ایک رسالہ "دلائل النظام" کے نام سے موسوم ہے۔ وہ اب تک شائع نہیں ہو سکا ہے لیکن مولانا کی تفسیر کے کچھ اجزا اور تفسیر کا مقدمہ عربی اور اردو دونوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ جو ذہین اور منصف مزاج آدمی بھی ان کا مطالعہ کرے گا وہ دو باتوں کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک تو اس بات کا کہ قرآن مجید کے اندر نظم کا انکار قرآن پر بہت بڑا ظلم ہے۔ دوسری اس بات کا کہ قرآن کے معارف و حکم کا اصل خزانہ درحقیقت اس کے نظم ہی کے اندر پوشیدہ ہے۔

اگر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے اتنی مہلت دی ہوتی کہ وہ اپنے اصولوں کے مطابق اپنی تفسیر مکمل کر پاتے تو یہ چیز ہر مخالف کے اوپر حجت قائم کر دیتی لیکن یہ ہماری محرومی ہے کہ ان کی تفسیر کا بہت تھوڑا حصّہ لکھا جا سکا، خاص طور پر بڑی سورتوں میں سے تو کسی ایک سورہ کی تفسیر بھی وہ مکمل نہ کر سکے۔ یہ چیز بعض لوگوں کے ذہن میں کھٹک پیدا کرتی ہے کہ ممکن ہے مولانا کو چھوٹی سورتوں کے نظم بیان کرنے میں جو کامیابی ہوئی ہے، وہ کامیابی ان کو بڑی سورتوں کے نظم کھولنے میں نہ ہوتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض بڑی سورتوں، مثلاً بقرہ اور آلِ عمران میں بظاہر نظم کی جو مشکلات نظر آتی ہیں، چھوٹی سورتوں میں اس طرح کی مشکلات نہیں ہیں۔ خاص طور پر بقرہ تو سمجھیے کہ بہت شکن مشکلات کا مجموعہ ہے۔ میں نے اسی خیال سے جب تفسیر پر کام شروع کیا تو اس کا آغاز فاتحہ سے کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی رہنمائی اور توفیق بخشی سے میں بقرہ اور آلِ عمران کی مشکلات حل کرنے میں کامیاب ہوگیا تو یہ چیز لوگوں کا تردد دور کرنے میں بڑی موثر ثابت ہوگی۔ مجھے اس کوشش میں کس حد تک کامیابی ہوئی ہے اس کا صحیح صحیح اندازہ تو اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے ہی کر سکیں گے میں جو کچھ عرض کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں نے کسی مقام میں بھی بات بنانے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ جو کچھ بھی لکھا ہے اس پر میرا ذہن و ضمیر پوری طرح مطمئن ہے۔ امکان ہے تو دو باتوں کا، جن سے میں اپنے آپ کو بری قرار نہیں دے سکتا۔ ایک اس کا کہ کہیں میری عقل نے ٹھوکر کھائی ہو اور میں بات کو سمجھ نہ سکا ہوں، دوسرے اس کا کہ کسی مسئلے کو کھولنے میں میرے قلم نے میری پوری مدد نہ کی ہو جس کے سبب سے بات ادھوری رہ گئی ہو۔

## دو سوال اور اُن کے جواب:

بعض لوگ جو نظم کی قدر و قیمت سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں، عموماً اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے دو سوال اٹھاتے ہیں۔ ایک یہ کہ نظم اگر ہے بھی تو اس کی حیثیت نکات اور لطائف کی ہے، اس کے اوپر قرآن کے سمجھنے اور نہ سمجھنے کا انحصار نہیں ہے، پھر اس پر اس شدومد سے زور دینے کی کیا ضرورت ہے؟ دوسرا یہ کہ اگر قرآن میں نظم ہے تو آخر وہ اس قدر مخفی قسم کا کیوں ہے کہ صرف خال خال لوگ ہی اس کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو سکے اور وہ بھی برسوں کی جان کاہی اور دماغ سوزی کے بعد؟ یہاں مختصر طور پر ہم ان دونوں سوالوں کے جواب بھی عرض کر دینا چاہتے ہیں۔

## نظم کی قدر و قیمت:

نظم کے متعلق یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ محض علمی لطائف کے قسم کی ایک چیز ہے جس کی قرآن کے اصل مقصد کے نقطۂ نظر سے کوئی خاص قدر و قیمت نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک تو اس کی اصل قدر و قیمت یہی ہے کہ قرآن کے علوم اور اس کی حکمت تک رسائی اگر ہو سکتی ہے تو اسی کے واسطے سے ہو سکتی ہے۔ جو شخص نظم کی رہنمائی کے بغیر قرآن کو پڑھے گا وہ زیادہ سے زیادہ جو حاصل کر سکے گا وہ کچھ منفرد احکام اور منفرد قسم کی ہدایات ہیں۔

اگرچہ ایک اعلیٰ کتاب کے منفرد احکام اور اس کی مفرد ہدایات کی بھی بڑی قدر و قیمت ہے لیکن آسمان و زمین کا فرق ہے اس بات میں کہ آپ طب کی کسی کتاب المفردات سے چند جڑی بوٹیوں کے کچھ اثرات و خواص معلوم کر لیں اور اس بات میں کہ ایک حاذق طبیب ان اجزا سے کوئی کیمیا اثر نسخہ ترتیب دے دے۔ تاج محل کی تعمیر میں جو سالا استعمال ہوا ہے وہ الگ الگ دنیا کی بہت سی عمارتوں میں استعمال ہوا ہوگا لیکن اس کے باوجود تاج محل دنیا میں ایک ہی ہے۔ میں بلا تشبیہ یہ بات عرض کرتا ہوں کہ قرآن حکیم بھی جن الفاظ اور فقروں سے ترکیب پایا ہے وہ بہر حال عربی لغت اور عربی زبان ہی سے تعلق رکھنے والے ہیں لیکن قرآن کی لاہوتی ترتیب نے ان کو وہ جمال و کمال بخش دیا ہے کہ اس زمین کی کوئی چیز بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

جس طرح خاندانوں کے شجرے ہوتے ہیں اسی طرح نیکیوں اور بدیوں کے بھی شجرے ہیں۔ بعض اوقات ایک نیکی کو ہم معمولی نیکی سمجھتے ہیں حالانکہ اس نیکی کا تعلق نیکیوں کے اس خاندان سے ہوتا ہے جس سے تمام بڑی نیکیوں کی شاخیں پھوٹی ہیں۔ اسی طرح بسا اوقات ایک برائی کو ہم معمولی برائی سمجھتے ہیں لیکن وہ برائیوں کے اس کنبے سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہے جو تمام مہلک بیماریوں کو جنم دینے والا کنبہ ہے۔ جو شخص دین کی حکمت سمجھنا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خیر و شر کے ان تمام مراحل و مراتب سے اچھی طرح واقف ہو ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ دق کا پتہ دینے والی بیماری کو نزلے کا پیش خیمہ سمجھ بیٹھے اور نزلے کی آمد آمد کو دق کا مقدمۃ الجیش قرار دے دے۔ قرآن کی یہ حکمت اجزائے کلام سے نہیں بلکہ تمام تر نظم کلام سے واضح ہوتی ہے۔ اگر ایک شخص ایک سورہ کی الگ الگ آیتوں سے تو واقف ہو لیکن سورہ کے اندر ان آیتوں کے باہمی حکیمانہ نظم سے واقف نہ ہو تو اس حکمت سے وہ کبھی آشنا نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح قرآن نے مختلف سورتوں میں مختلف اصولی باتوں پر آفاقی و انفسی یا تاریخی دلائل بیان کیے ہیں۔ یہ دلائل نہایت حکیمانہ ترتیب کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ جس شخص پر یہ ترتیب واضح ہو وہ جب اس سورہ کی تدبر کے ساتھ تلاوت کرتا ہے تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ زیر بحث موضوع پر اس نے ایک نہایت جامع، مدلل اور شرح صدر بخشنے والا خطبہ پڑھا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اس ترتیب سے بے خبر ہو وہ اجزا سے اگرچہ واقف ہوتا ہے لیکن اس حکمت سے وہ بالکل ہی محروم رہتا ہے جو اس سورہ میں بیان ہوئی ہوتی ہے۔

یہ تو اس مسئلے کا علمی و نظری پہلو ہوا۔ اس کا سیاسی و اجتماعی پہلو بھی نہایت اہم ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ اس ملت مسلمہ کی شیرازہ بندی قرآن مجید کی حبل اللہ المتین ہی کے ذریعے سے ہوئی ہے اور تمام مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ سب مل کر اس رسی کو مضبوطی سے پکڑیں اور متفرق نہ ہوں۔ اس ہدایت کا یہ فطری تقاضا ہے کہ ہمارے درمیان جتنے بھی اختلاف پیدا ہوں ہم ان کے فیصلے کے لیے رجوع قرآن کی طرف کریں۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ خود قرآن کے بارے میں ہماری رائیں متفق نہیں ہیں۔ ایک ایک آیت کی تاویل میں نہ جانے کتنے اقوال ہیں اور ان اقوال میں سے اکثر ایک دوسرے سے متناقض ہیں لیکن کوئی چیز ہمارے پاس ایسی نہیں ہے جو یہ فیصلہ کر سکے کہ ان میں سے کون سا قول حق ہے۔ کسی کلام کی تاویل میں اختلاف واقع ہو تو اس اختلاف کو رفع کرنے

کے لیے سب سے زیادہ اطمینان بخش چیز اس کا سیاق و سباق اور نظام ہی ہو سکتا ہے لیکن قرآن کے معاملے میں یہ مصیبت ہے کہ لوگ اس کے اندر کسی نظام کے قائل ہی نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ہاں جو اختلاف بھی پیدا ہوا اس نے اپنا مستقل علم گاڑ دیا۔ ہماری فقہ کے بہت سے اختلافات صرف بات کو اس کے سیاق اور نظم میں نہ دیکھنے سے پیدا ہوئے ہیں۔ اگر سیاق و نظم کو ملحوظ رکھا جائے تو اکثر مقامات ایسے ہیں جہاں ایک قول کے سوا کسی دوسرے قول کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی۔

فقہی اختلافات سے زیادہ سنگین معاملہ گمراہ فرقوں کی ضلالتوں کا ہے۔ ہمارے اندر جتنے بھی گمراہ فرقے پیدا ہوئے ہیں ان میں سے اکثر نے قرآنی آیات ہی کا سہارا لیا ہے۔ ایک آیت کو اس کے سیاق و سباق سے کاٹا اور پھر جو جی میں آیا اس کے اندر معنی پہنا دیے۔ ظاہر ہے کہ ایک کلام کو اس کے نظم اور سیاق و سباق سے الگ کر کے اس کے اندر آپ معنی پہنانے چاہیں تو بہت سے معنی پہنا سکتے ہیں جن میں سے بعض ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کا تصور اس قول کا کہنے والا کبھی نہیں کر سکتا۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں یہاں بہت سی ایسی آیتوں کا حوالہ دے سکتا ہوں جو تحریروں اور تقریروں میں نہایت غلط بلکہ گمراہ کن معنوں میں استعمال ہو رہی ہیں لیکن کسی کو بھی یہ توفیق نہیں ہوتی کہ ذرا تکلیف کر کے یہ دیکھ لے کہ آیت کس موقع محل کی ہے اور اس کا سیاق و سباق کیا ہے۔ قرآن کے معاملے میں جیسا کہ میں نے عرض کیا ان کے نزدیک نظم اور موقع و محل کا کوئی سوال ہی سرے سے نہیں ہے۔

میں نے اس تفسیر میں چونکہ نظم کلام کو پوری اہمیت دی ہے اس وجہ سے ہر جگہ میں نے ایک ہی قول اختیار کیا ہے بلکہ اگر میں اس حقیقت کو صحیح لفظوں میں بیان کروں تو مجھے یوں کہنا چاہیے کہ مجھے ایک ہی قول اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے کیونکہ نظم کی رعایت کے بعد مختلف وادیوں میں گردش کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ صحیح بات اس طرح منقح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ آدمی اگر بالکل اندھا بہرا متعصب نہ ہو تو اپنی جان تو قربان کر سکتا ہے لیکن اس سے انحراف برداشت نہیں کر سکتا۔

## نظم کا اشکال:

اب آئیے اس سوال پر غور کیجیے کہ جب قرآن کے سمجھنے کے لیے نظم کی یہ اہمیت ہے تو آخر اس کو اتنا مخفی کیوں کر دیا گیا ہے کہ امام رازیؒ جیسے ذہین آدمی کی کوششیں بھی اس کو کھولنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکیں۔ اس سوال کے جواب کے کئی پہلو ہیں۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ قرآن کا یہ اشکال جو ہے یہ درحقیقت قرآن کا اشکال نہیں ہے بلکہ یہ ہمارا اپنا اشکال ہے۔ قرآن نے اول اول جن لوگوں کو مخاطب کیا ان کو اس کے نظم کے بارے میں کوئی اشکال پیش نہیں آیا۔ زبان ان کی تھی، گرد و پیش ان کا تھا، حالات و مسائل اور اعتراضات و سوالات ان کے تھے۔ جو پارٹیاں قرآن کی مخاطب تھیں وہ سب سامنے موجود تھیں اور وہ جس قسم کے نظریات و عقائد رکھتی تھیں وہ سب معلوم و معروف تھے۔ اس وجہ سے قرآن مجید

کے لطیف سے لطیف اشارات اور مخفی سے مخفی کنایات بھی سمجھ لینے میں انھیں کوئی زحمت پیش نہیں آتی تھی جہاں آیات اتریں، بے تکلف ان کے ذہن ہر اشارے و کنائے کے محل و مصداق تک پہنچ گئے اور انھوں نے کلام کے پورے مالۂ وما علیہ کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ کم از کم ان لوگوں کے لیے تو اس کے سمجھ لینے میں کسی زحمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا جو سارے حالات سے خود متعلق بھی تھے اور ذہین بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا حال مذکورہ تمام اعتبارات سے ان سے بالکل مختلف ہے۔ نہ زبان ہماری ہے نہ حالات و مسائل ہمارے ہیں۔ زمانے میں بھی صدیوں اور قرنوں کا فرق ہے۔ ایسی صورت میں قرآن کے سمجھنے میں ہمیں جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ بالکل فطری ہیں۔ بقدرِ ضرورت عملی و اخلاقی تعلیمات و ہدایات کو سمجھ لینے کی بات تو اور ہے لیکن اگر کوئی شخص ربط و نظام کی باریکیوں اور کلام کے منطقی تسلسل اور اس کے اسرار و حقائق کو سمجھنا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ اسے نہ صرف زبان کی اجنبیت کو دور کرنا پڑے گا بلکہ ذہنی و فکری صوٗ کے ذریعے سے اس بُعدِ زمانی پر بھی غالب آنا پڑے گا جو اس کے اور قرآن کے زمانۂ نزول کے درمیان حائل ہے اور یہ چیز ظاہر ہے کہ ایک عظیم فکری و علمی جہاد کے بعد ہی ممکن ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی چیز کے اجزا اور اس کی ترکیب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اجزا کا علم بہت آسان ہوتا ہے لیکن ترکیب کے علم کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ نظم کا علم درحقیقت ترکیب کا علم ہے۔ یہ صرف یہی نہیں بتاتا کہ فلاں آیت سے فلاں آیت کا کیا جوڑ ہے بلکہ اس کا اصلی مقصد دین و اخلاق کے اجزا کے باہمی ربط کو واضح کرنا ہے ظاہر ہے کہ یہ مقصد ایک نہایت اعلیٰ علمی مقصد ہے۔ یہی چیز ہے جس کو حکمت کہتے ہیں۔ حکمت بہرحال ایک مخفی خزانہ ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ اگر کوئی شخص صرف یہ جاننا چاہے کہ قرآن نے عملی زندگی کے لیے کیا احکام دیے ہیں تو اس کے لیے اسے کسی بڑی کاوش کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص دین کی حکمت معلوم کرنا چاہے تو اسے بہرحال قرآن کے اندر معتکف ہونا اور اس کے لیے ساری زندگی کو قربان کرنا پڑے گا۔

تیسری چیز یہ ہے کہ عربی زبان کی (بالخصوص اس زبان کی جس میں قرآن ہے) کچھ خصوصیات ہیں جو صرف اسی کے ساتھ خاص ہیں۔ بلیغ عربی زبان میں تعبیرِ مدعا کے لیے الفاظ کا سہارا اسی حد تک لیا جاتا ہے جس حد تک ناگزیر ہے اگر کوئی شخص اس حد سے آگے بڑھ جائے تو یہ کلام کا عیب ہے جس کو قائل کے عجز کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ عرب کے لوگ نہایت ذہین تھے اس وجہ سے وہ کلام کے اندر سے ان تمام اجزا کو حذف کر دیتے تھے جن کو ایک ذہین سامع خود سمجھ لیتا ہے یا اسے سمجھ لینا چاہیے۔ زمانۂ نزولِ قرآن کے ادب اور قرآن کے مطالعے سے اس حذف و ایجاز کے بہت سے اصول سامنے آتے ہیں جو ایک فنی ترتیب کے ساتھ میرے استاذ مولانا فراہیؒ نے اپنی ایک کتاب —— کتاب الاسالیب —— میں جمع کر دیے ہیں۔ میرے لیے ان تمام اصولوں کو یہاں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ صرف ایک بات محض بطورِ مثال عرض کرتا ہوں جس سے اس بات کا کچھ اندازہ ہو سکے گا جس کی طرف میں یہاں اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے اور اہلِ عرب کے درمیان ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ ہم ایک بات کے بعد جب دوسری بات اس کی دلیل یا اس کی مثال یا اس کے نتیجہ یا اس کی تکمیل یا اس پر استدراک یا کسی اور پہلو سے کہیں گے تو اس رابطہ کو لازماً ظاہر کریں گے جو دونو

کے تعلق کی نوعیت کو واضح کر دے۔ اس مدعا کے لیے ہماری زبان میں بہت سے الفاظ اور اسلوب ہیں جن کا سہارا لیے بغیر ہم ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ اہلِ عرب کا طریقہ اس معاملے میں ہمارے طریقہ سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اس طرح کے مواقع میں زیادہ اعتماد سامع کی ذہانت پر کرتے ہیں اور رابطہ کو حذف کر دیتے ہیں کہ سامع کا ذہن خود اس خلا کو بھرے گا۔ اہلِ عرب اس حذف و ایجاز کو کلام کا حسن اور اس کی بلاغت قرار دیتے لیکن یہی چیز ہمارے لیے نظم کی مشکلات پیدا کر دیتی ہے۔ ہم کلام کی مخفی کڑیوں سے بے خبر ہونے کی وجہ سے ہر بات کو الگ الگ سمجھ بیٹھتے ہیں۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں تمام علم اولین و آخرین ہے۔ اسے رہتی دنیا تک باقی رہنا اور خلق کی رہنمائی کرنا ہے۔ اس کے عجائب کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں۔ یہ جس طرح آج سے کم و بیش چودہ سو سال پہلے دنیا کی رہنمائی کے لیے تمام صفات اور صلاحیتوں سے بھرپور تھی اسی طرح آج بھی ہے اور اسی طرح قیامت تک رہے گی۔ قوموں کے بعد قومیں اٹھیں گی اور ان میں سے جو اس کی طرف رجوع کریں گی وہ سب اپنے ظرف کے بقدر اس میں سے حصہ پائیں گی، لیکن سب کے حصہ پانے کے بعد بھی اس کے ذخیرۂ علم و حکمت میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ سمندر سے ایک سوئی کی نوک پانی کی جتنی مقدار اٹھا سکتی ہے قیامت تک سب مل کر بھی اس سے زیادہ اس کے ذخیرۂ علم کو کم نہیں کر سکتے۔ یہ سارا خزانۂ علم اس کتاب کے اتارنے والے نے اس کے الفاظ اور اس کے نظام کے اندر ودیعت کر دیا ہے اس وجہ سے اس کی نوعیت کسی سپاٹ کتاب کی نہیں ہے کہ آپ اس کو دو چار مرتبہ پڑھ لیں اور اس کے اندر جو کچھ ہے اس کو اخذ کر لیں بلکہ اس کی حیثیت ایک معدن کی سی ہے جس کے اندر جتنی ہی گہری کھدائی کی جائے اتنے ہی اس سے خزانے پر خزانے نکلتے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو صرف ایک دو بار پڑھ لینے کی ہدایت نہیں ہوئی بلکہ بار بار مختلف شکلوں اور مختلف مقداروں میں تلاوت کرتے رہنے اور اس پر برابر تدبر کرتے رہنے کی ہدایت ہوئی۔

## قرآن کا نظام بحیثیت مجموعی :

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا تعلق ہر سورہ کے اندرونی نظم سے ہے۔ یعنی ہر سورہ ایک مستقل وحدت ہے، اس کا ایک علیحدہ عنوان و موضوع (عمود) ہے اور اس سورہ کے تمام اجزائے کلام اس عنوان و موضوع سے نہایت گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ اب ایک قدم آگے بڑھ کر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن میں بحیثیت مجموعی بھی ایک مخصوص نظام ہے جس کا ایک پہلو تو بالکل ظاہر ہے جو ہر شخص کو نظر آ سکتا ہے لیکن ایک پہلو مخفی ہے جو غور و تدبر سے سامنے آتا ہے۔ میں ان دونوں پہلوؤں پر بالاجمال روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ پہلے اس کے ظاہری پہلو پر نظر ڈالیے۔

## قرآن کے مجموعی نظام کا ظاہری پہلو :

اگر آپ سورتوں کی اس ترتیب پر ایک نظر ڈالیں، جس ترتیب سے وہ مصحف میں ہیں تو ایک چیز آپ کو بالکل صاف نظر آئے گی کہ قرآن میں مکی اور مدنی سورتوں کے ملے جلے سات گروپ بن گئے ہیں جن میں سے ہر گروپ ایک یا ایک سے زائد مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور ایک یا ایک سے زیادہ مدنی سورتوں پر تمام ہوتا ہے۔ ہر گروپ میں پہلے مکی سورتیں ہیں۔ ان کے بعد مدنی سورتیں ہیں۔

پہلا گروپ فاتحہ سے شروع ہوتا ہے، مائدہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس گروپ میں فاتحہ مکی ہے باقی چار مدنی ہیں۔

دوسرا گروپ انعام اور اعراف دو مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور انفال و توبہ دو مدنی سورتوں پر ختم ہوتا ہے۔

تیسرے گروپ میں پہلے ۱۴ سورتیں یونس تا مومنون مکی ہیں۔ آخر میں سورہ نور ہے جو مدنی ہے۔ اس گروپ کی دو سورتوں رعد اور حج کو بعض لوگوں نے مدنیات میں شمار کیا ہے لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اس مسئلے پر ہم مذکورہ سورتوں کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

چوتھا گروپ فرقان سے شروع ہوتا ہے، احزاب پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں ۸ سورتیں مکی ہیں۔ آخر میں ایک احزاب مدنی ہے۔

پانچواں گروپ سبا سے شروع ہوتا ہے، حجرات پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں ۱۳ سورتیں مکی ہیں اور آخری تین مدنی ہیں۔

چھٹا گروپ ق سے شروع ہو کر تحریم پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں پہلے سات مکی ہیں اس کے بعد دس مدنی۔ اس گروپ میں بعض لوگوں نے سورہ رحمان کو مدنی قرار دیا ہے لیکن ہم سورہ کی تفسیر میں واضح کریں گے کہ یہ خیال بے بنیاد ہے۔

ساتواں گروپ ملک سے شروع ہو کر الناس پر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس میں بھی مکیات اور مدنیات کی ترتیب اسی طرح ہے جس طرح دوسرے گروپوں میں ہے لیکن اس کی سورہ دہر اور آخری بعض سورتوں کے بارے میں چونکہ اختلافات ہیں اس وجہ سے ان پر بھی ہم ان سورتوں کی تفسیر ہی میں بحث کریں گے۔

سورتوں کی یہ ترتیب، ہر صاحب علم جانتا ہے کہ اتفاقی نہیں بلکہ توقیفی ہے۔ یہ وہ ترتیب ہے جس ترتیب پر قرآن لوح محفوظ میں ہے۔ یہی ترتیب ہے جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریل امین، جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے، ہر رمضان میں قرآن مجید کا مذاکرہ فرماتے تھے۔ اسی ترتیب کے مطابق صحابہ رضی اللہ عنہم بھی رمضان میں قرآن مجید سنتے سناتے تھے۔ اور اسی ترتیب کے مطابق سیدنا عثمان غنیؓ نے مصحف کی نقلیں تمام ممالک اسلامیہ میں بھجوائیں۔ اس وجہ سے یہ ترتیب حکمت سے خالی نہیں ہو سکتی۔

## قرآن کے مجموعی نظام کا مخفی پہلو:

مذکورہ ساتوں گروپوں کی تلاوت اگر بار بار غور و تدبر کے ساتھ کی جائے تو اس ترتیب کی بہت سی حکمتیں واضح ہوتی ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

(۱) جس طرح ہر سورہ کا ایک خاص عمود ہوتا ہے جس سے سورہ کے تمام اجزائے کلام وابستہ ہوتے ہیں اسی طرح ہر گروپ کا بھی ایک جامع عمود ہے اور اس گروپ کی تمام سورتیں اسی جامع عمود کے کسی خاص پہلو کی حامل ہیں۔ مطالب اگرچہ ہر گروپ میں مشترک سے ہیں لیکن اس اشتراک کے ساتھ جامع عمود کی چھاپ ہر گروپ پر نمایاں ہے۔ الگ الگ ہر گروپ کے موضوع پر بحث کے لیے موزوں جگہ یہاں نہیں ہے بلکہ تفسیر میں، ہر گروپ کی تمہید میں ہے۔ یہاں مثال کے طور پر اتنی بات ذہن میں رکھیے کہ کسی گروپ میں قانون و شریعت کا رنگ غالب ہے کسی میں ملت ابراہیمؑ کی تاریخ اور اس کے اصول و فروع کا۔ کسی میں کشمکش حق و باطل اور اس کے بارے میں سنن الٰہیہ کے بیان کا حصہ نمایاں ہے، کسی میں نبوت و رسالت اور اس کے خصائص و امتیازات کا کسی میں توحید اور اس کے لوازم و مقتضیات ابھرے ہوئے نظر آئیں گے کسی میں بعث، حشر و نشر اور ان کے متعلقات۔ آخری گروپ منذرات کا ہے جو بیشتر ان مکی سورتوں پر مشتمل ہے جو جھنجوڑنے اور جگانے والی ہیں اور جنھوں نے پورے عرب میں ہلچل برپا کر دی۔

(۲) ہر گروپ میں جو مدنی سورتیں شامل ہیں وہ اپنے گروپ کے مجموعی مزاج سے بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہیں۔ ان کو اپنے گروپ کی مکی سورتوں سے وہی مناسبت ہے جو مناسبت کسی درخت کی جڑ اور اس کی شاخوں میں ہوتی ہے۔

(۳) ہر سورہ زوج زوج ہے۔ یعنی ہر سورہ اپنا ایک جوڑا اور مثنیٰ بھی رکھتی ہے اور ان دونوں میں اسی طرح کی مناسبت ہے جس طرح کی مناسبت زوجین میں ہوتی ہے۔ یعنی ایک میں جو خلا ہوتا ہے دوسری اس خلا کو بھرتی ہے۔ ایک میں جو پہلو مخفی ہے، دوسری اس کو اجاگر کرتی ہے اور اس طرح دونوں مل کر چاند اور سورج کی شکل میں نمایاں ہوتی ہیں۔ بڑی سورتوں میں اس کو بقرہ اور آل عمران کی مثال سے اور چھوٹی سورتوں میں معوذتین کی مثال سے سمجھیے۔ قرآن میں یہ نظام بالکل کائنات کے نظام کے مشابہ ہے۔ اس کائنات میں بھی ہر چیز جوڑا جوڑا ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں میں بالعموم سورتوں کی تلاوت میں اس نسبت کو ملحوظ رکھتے تھے۔ سورۂ قیامہ اور دہر، سورۂ صف اور سورۂ جمعہ، اعلیٰ اور غاشیہ آپ نمازوں میں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔

(۴) صرف سورہ فاتحہ اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سورہ درحقیقت پورے قرآن کے لیے بمنزلہ دیباچہ ہے۔ اس سورہ کی تفسیر میں ہم نے واضح کیا ہے کہ اس نے اپنے اندر پورے قرآن کے بنیادی حقائق جمع کر لیے ہیں۔ یہ اپنے گروپ کے لیے بھی دیباچہ کی حیثیت رکھتی ہے اور پورے قرآن کے لیے بھی۔ اس کے مختلف ناموں میں سے ایک نام کافیہ بھی ہے۔ اس سے بھی یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ خود مکتفی سورت ہے۔ یہ اپنے ساتھ کسی دوسری

سورت کے ملنے کی محتاج نہیں ہے۔

(۵) بعض سورتیں ایسی بھی ہیں جن کی حیثیت ضمنی سورہ کی ہے۔ یعنی وہ کسی سورہ کے مستقل مثنیٰ کی حیثیت نہیں رکھتی ہیں بلکہ اپنی ماسبق کے کسی ایک اہم پہلو کی وضاحت کے طور پر نازل ہوتی ہیں۔ اس کی ایک مثال سورہ حجرات ہے جو اپنی سابق سورہ کی ایک آیت کی توضیح کی حیثیت رکھتی ہے۔ تفسیر میں اس کی وضاحت آئے گی۔

(۶) ہر گروپ پر الگ الگ تدبر کرنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ہر ایک کے اندر اسلامی دعوت کے تمام ادوار ابتدا سے لے کر انتہا تک نمایاں ہوئے ہیں۔ البتہ نمایاں ہونے کا پہلو ہر ایک کے اندر مختلف ہے، نیز ایجاز اور تفصیل کے اعتبار سے انداز الگ الگ ہیں۔

(۷) یہ بات بھی نظر آتی ہے کہ اس ترتیب میں قانون و شریعت کے گروپ کو تمام دوسرے گروپوں پر مقدم کر دیا گیا ہے اور منذرات کے گروپ کو آخر میں کر دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انذار سے مقصود درحقیقت لوگوں کو غلط راہ سے موڑ کر صحیح راہ پر لگانا ہے اور صحیح راہ شریعت کی راہ ہے اس وجہ سے جو چیز غایت و مقصود کی حیثیت رکھتی ہے اس پر سب سے پہلے نگاہ پڑنی چاہیئے۔ امت کو بحیثیت امتِ مسلمہ جو دولت عطا ہوئی ہے وہ درحقیقت شریعت ہی ہے جو اہل کتاب سے اس امت کو منتقل ہوئی اس وجہ سے پہلے گروپ میں اہل کتاب کی معزولی بھی بیان ہوئی اور شریعت اسلامی کی تفصیل بھی۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے پہلے گروپ اور اس کے آخری گروپ میں وہی نسبت ہے جو نسبت ایک عمارت اور اس کی بنیاد میں ہوتی ہے جہاں تک تعمیر کا تعلق ہے تعمیر سے پہلے بنیاد ہوتی ہے لیکن عمارت بن چکنے کے بعد سامنے جو چیز آتی ہے وہ عمارت ہوتی ہے، بنیاد نیچے ہو جاتی ہے۔

جب میرے سامنے قرآن عظیم کے یہ ساتوں گروپ آتے ہیں اور ساتھ ہی سورتوں کے جوڑے جوڑے ہونے پر نظر پڑتی ہے تو بے ساختہ میرا ذہن وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ (۸۷ - حجر) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن اس آیت سے متعلق چونکہ بہت سی باتیں بحث طلب ہیں اس وجہ سے اس پر مفصل گفتگو اپنے مقام ہی پر موزوں رہے گی۔

## تفسیر قرآن بالقرآن:

تیسری چیز جو اس تفسیر میں میں نے بطورِ اصول کے پیشِ نظر رکھی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن کی مدد سے کی جائے۔ قرآن نے خود اپنی تعریف کِتَابًا مُتَشَابِهًا کے الفاظ سے کی ہے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (۲۳ - زمر) — اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے، کتاب باہم دگر مشابہ، جوڑے جوڑے۔

اسی طرح یہ بات بھی قرآن نے بار بار واضح فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کی باتیں اور اپنی آیات مختلف

شکلوں اور گوناگوں پیرایوں سے پیش فرمائی ہیں۔ اس کے لیے "تصریف" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی گردش دینے کے ہیں۔ اگر آپ قرآن کی تلاوت کیجیے تو آپ محسوس کریں گے کہ ایک مضمون مختلف سورتوں میں بار بار سامنے آتا ہے۔ ایک مبتدی یہ دیکھ کر خیال کرتا ہے کہ یہ ایک ہی مضمون کی تکرار ہے لیکن قرآن پر تدبر کرنے والے جانتے ہیں کہ قرآن تکرار محض سے بالکل پاک ہے۔ اس میں ایک بات جو بار بار آتی ہے تو بعینہٖ ایک ہی پیش و عقب اور ایک ہی قسم کے لواحق و تضمنات کے ساتھ نہیں آتی بلکہ ہر جگہ اس کے اطراف و جوانب اور اس کے تعلقات و روابط بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔ مقام کی مناسبت سے اس میں مناسبِ حال تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ ایک مقام میں ایک پہلو مخفی ہوتا ہے دوسرے مقام میں وہ واضح ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ اس کا اصل رُخ غیر معیّن ہوتا ہے، دوسرے سیاق و سباق میں وہ رخ بالکل معیّن ہو جاتا ہے بلکہ میرا ذاتی تجربہ اور مدتوں کا تجربہ تو یہ ہے کہ ایک ہی لفظ ایک آیت میں بالکل مبہم نظر آتا ہے دوسری آیت میں وہ بالکل بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ ایک بات کی دلیل سمجھ میں نہیں آتی لیکن دوسری جگہ وہ بالکل آفتاب کی طرح روشن نظر آتی ہے۔

قرآن کا یہ اسلوب ظاہر ہے کہ اسی مقصد کے لیے ہے کہ اس کی ہر بات طالب کے ذہن نشین ہو جائے چنانچہ میں بطور تحدیثِ نعمت کے یہ عرض کرتا ہوں کہ مجھ پر قرآن کی مشکلات جتنی خود قرآن سے واضح ہوئی ہیں دوسری کسی بھی چیز سے واضح نہیں ہوئی ہیں۔ میر انیس نے کہا ہے کہ ع

اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

ممکن ہے خود ان کے اپنے کلام کے بارے میں یہ محض شاعرانہ مبالغہ آرائی ہو لیکن قرآن کے باب میں یہ بات بالکل حق ہے۔ ایک ایک بات اتنے گوناگوں و بوقلموں اسلوبوں سے سامنے آتی ہے کہ اگر آدمی ذہنِ سلیم رکھتا ہو تو اس کو پکڑ ہی لیتا ہے۔

اس تفسیر کو پڑھنے والے انشاء اللہ محسوس کریں گے کہ میں نے نہ صرف آیات کے نظم اور ان کی تاویل کے تعین میں اصلی اعتماد قرآن ہی کے شواہد و نظائر پر کیا ہے بلکہ الفاظ و اسالیب کی مشکلات میں بھی بیشتر قرآن ہی سے استفادہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں لغت یا نحو کی کتابوں کے حوالے نہیں دے سکتا تھا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ معانی و حقائق کی طرح قرآن اپنی ادبی و نحوی مشکلات کے حل کے لیے بھی سب سے زیادہ مستند مرجع و ماخذ ہے۔ اس حقیقت کو ہمارے پچھلے علما نے بھی تسلیم کیا ہے۔

## ۳۔ فہمِ قرآن کے خارجی وسائل

فہمِ قرآن کے خارجی وسائل میں سے جن جن چیزوں سے، جس نوعیت سے، میں نے اس تفسیر میں فائدہ اٹھایا ہے اب مختصر طور پر ان کا تذکرہ کروں گا۔

## سنّتِ متواترہ و مشہورہ :

جہاں تک قرآن مجید کی اصطلاحات کا تعلق ہے، مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج، عمرہ، قربانی، مسجد حرام، صفا مروہ، سعی، طواف وغیرہ، ان کی تفسیر میں نے سو فی صدی سنّت متواترہ کی روشنی میں کی ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید اور شریعت کی اصطلاحات کا مفہوم بیان کرنے کا حق صرف صاحب وحی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہے۔ آپ جس طرح اس کتاب کے لانے والے تھے اسی طرح اس کے معلم اور مبیّن بھی تھے اور یہ تعلیم و تبیین آپ کے فریضۂ رسالت ہی کا ایک حصّہ تھی۔ اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ یہ بات قطعیت کے ساتھ معلوم ہو کہ فلاں اصطلاح کا یہ مطلب خود آنحضرت صلعم نے بتایا ہے۔ سو جہاں تک معروف دینی اصطلاحات کا تعلق ہے یہ سوال کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ اس قسم کی ساری اصطلاحات کا حقیقی مفہوم بالکل عملی شکل میں سنت متواترہ کے اندر محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اور یہ سنتِ متواترہ بعینہٖ انھی قطعی ذرائع سے ثابت ہے جن سے قرآن مجید ثابت ہے۔ اُمّت کے جس تواتر نے قرآن کریم کو ہم تک منتقل کیا ہے اسی تواتر نے دین کی تمام اصطلاحات کا عملی مفہوم بھی ہم تک منتقل کیا ہے۔ اگر فرق ہے تو یہ فرق ہے کہ ایک چیز قولی تواتر سے منتقل ہوئی ہے، دوسری چیز عملی تواتر سے۔ اس وجہ سے اگر قرآن مجید کو ماننا ہم پر واجب ہے تو ان ساری اصطلاحات کی اس عملی صورت کو ماننا بھی واجب ہے جو سلف سے خلف تک بالتواتر منتقل ہوئی ہے۔ ان کی صورت میں اگر کوئی جزوی قسم کا اختلاف ہے تو اس اختلاف کی دین میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ پانچ وقت کی نمازیں سب جانتے اور مانتے ہیں اور اسی قطعیت کے ساتھ جانتے اور مانتے ہیں جس قطعیت کے ساتھ قرآن کو جانتے اور مانتے ہیں، رہا بعض جزوی امور میں کوئی فرق تو یہ فرق کوئی اہمیت رکھنے والی شے نہیں ہے۔ اس طرح کے معاملات میں دلائل کی روشنی میں جس پہلو پر بھی جس کا اطمینان ہو اس کو اختیار کر سکتا ہے۔

منکرین حدیث کی یہ جسارت کہ وہ صوم و صلوٰۃ، حج و زکوٰۃ اور عمرہ و قربانی کا مفہوم بھی اپنے جی سے بیان کرتے ہیں اور اُمّت کے تواتر نے ان کی جو شکل ہم تک منتقل کی ہے اس میں اپنی ہوائے نفس کے مطابق ترمیم و تغیر کرنا چاہتے ہیں، صریحاً خود قرآن مجید کے انکار کے مترادف ہے اس لیے کہ جس تواتر نے ہم تک قرآن کو منتقل کیا ہے اسی تواتر نے ان اصطلاحات کی عملی صورتوں کو بھی ہم تک منتقل کیا ہے۔ اگر وہ ان کو نہیں مانتے تو پھر خود قرآن کو ماننے کے لیے بھی کوئی وجہ باقی نہیں رہ جاتی۔ اصطلاحات کے معاملے میں تنہا لغت پر اعتماد بھی ایک بالکل غلط چیز ہے۔ صوم و صلوٰۃ کا لغت میں جو مفہوم بھی ہو لیکن دین میں ان کا وہی مفہوم معتبر ہوگا جو شارع نے واضح فرمایا ہے۔

ان دینی اصطلاحات کے بارے میں مولانا فراہیؒ اپنے مقدمۂ تفسیر میں فرماتے ہیں:

"اسی طرح تمام اصطلاحات شرعیہ مثلاً نماز، زکوٰۃ، جہاد، روزہ، حج، مسجد حرام، صفا، مروہ اور مناسک حج وغیرہ اور ان سے جو اعمال متعلق ہیں تواتر و توارث کے ساتھ سلف سے لے کر خلف تک سب محفوظ رہے۔ اس میں جو

معمولی جزوی اختلافات ہیں وہ بالکل ناقابلِ لحاظ ہیں۔ یشیر کے معنی سب کو معلوم ہیں اگرچہ مختلف ممالک کے شیروں کی شکلوں صورتوں میں کچھ نہ کچھ فرق ہے۔ اسی طرح جو نماز مطلوب ہے، وہی نماز ہے جو مسلمان پڑھتے ہیں، ہرچند کہ اس کی صورت و ہیئت میں بعض جزوی اختلافات ہیں۔ جو لوگ اس قسم کی چیزوں میں زیادہ کھوج کرید کرتے ہیں وہ اس دینِ قیم کے مزاج سے بالکل ہی ناآشنا ہیں جس کی تعلیم قرآن پاک نے دی ہے ....... پس جب ایسے اصطلاحی الفاظ کا معاملہ پیش آئے جن کی پوری حد و تصویر قرآن میں نہ بیان ہوئی ہو تو صحیح راہ یہ ہے کہ جتنے حصے پر تمام امت متفق ہے اتنے پر قناعت کرو اور اخبارِ آحاد پر زیادہ اصرار نہ کرو ورنہ خود بھی تنگی میں پڑو گے اور دوسروں کے اعمال کو بھی غلط ٹھہراؤ گے اور تمہارے درمیان کوئی ایسی چیز نہ ہوگی جو اس جھگڑے کا فیصلہ کر سکے۔"

تمام دینی اصطلاحات کے بارے میں اسی مسلک کو میں صحیح سمجھتا ہوں اور اسی کو میں نے اختیار کیا ہے۔ البتہ ان کے اسرار و مصالح بیں نے واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اس باب میں رہنمائی قرآن اور صحیح احادیث سے حاصل کی ہے۔

## احادیث و آثارِ صحابہ :

تفسیر کے ظنی ماخذوں میں سے سب سے اشرف اور سب سے زیادہ پاکیزہ چیز ذخیرۂ احادیث و آثار ہے۔ اگر ان کی صحت کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہوتا تو تفسیر میں ان کی وہی اہمیت ہوتی جو اہمیت سنت متواترہ کی بیان ہوئی ہے لیکن ان کی صحت پر اس طرح کا اطمینان چونکہ نہیں کیا جا سکتا اس وجہ سے ان سے اسی حد تک فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جس حد تک یہ ان قطعی اصولوں سے موافق ہوں جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ جو لوگ احادیث و آثار کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ ان کو خود قرآن پر بھی حاکم بنا دیتے ہیں وہ نہ تو قرآن کا درجہ پہچانتے ہیں نہ حدیث کا۔ برعکس اس کے جو لوگ احادیث و آثار کو سرے سے حجت ہی نہیں مانتے وہ اپنے آپ کو اس روشنی ہی سے محروم کر لیتے ہیں جو قرآن کے بعد سب سے زیادہ قیمتی روشنی ہے۔ میں احادیث کو تمام تر قرآن ہی سے ماخوذ و مستنبط سمجھتا ہوں اس وجہ سے میں نے صرف ان احادیث تک استفادے کو محدود نہیں رکھا ہے جو قرآن کی کسی آیت کے تعلق کی صراحت کے ساتھ وارد ہوئی ہیں بلکہ پورے ذخیرہ احادیث سے اپنے امکان کی حد تک فائدہ اٹھایا ہے، خاص طور پر حکمتِ قرآن کے مسائل میں جو مدد مجھے احادیث سے ملی ہے وہ کسی بھی دوسری چیز سے نہیں ملی۔ اگر کوئی حدیث مجھے ایسی ملی ہے جو قرآن سے متصادم نظر آئی ہے تو میں نے اس پر ایک عرصے تک توقف کیا ہے اور اسی صورت میں اس کو چھوڑا ہے جب مجھ پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ اس حدیث کو ماننے سے یا تو قرآن کی مخالفت لازم آتی ہے یا اس کی زد دین کے کسی اصول پر پڑتی ہے۔ جہاں تک صحیح احادیث کا تعلق ہے اس کی نوبت بہت کم آئی ہے کہ ان کی موافقت قرآن سے موہی نہ سکے لیکن اگر کہیں ایسی صورت پیش آئی ہے تو وہاں میں نے بہر حال قرآن مجید کو ترجیح دی ہے اور اپنے وجوہ ترجیح تفصیل کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں۔

## شانِ نزول :

شانِ نزول سے متعلق میرا جو مسلک ہے اور جس کی میں نے اس کتاب میں پیروی کی ہے وہ میں اپنے استاذ مولانا فراہیؒ کے الفاظ میں بیان کیے دیتا ہوں۔ مولانا اپنی تفسیر کے مقدمہ میں شانِ نزول سے متعلق لکھتے ہیں۔

"شانِ نزول کا مطلب، جیسا کہ بعض لوگوں نے غلطی سے سمجھا ہے، یہ نہیں ہے کہ وہ کسی آیت یا سورہ کے نزول کا سبب ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد لوگوں کی وہ حالت اور کیفیت ہوتی ہے جس پر وہ کلام بر سرِ موقع حاوی ہوتا ہے۔ کوئی سورہ ایسی نہیں ہے جس میں کسی خاص امر یا چند خاص امور کو مدِّنظر رکھے بغیر کلام کیا گیا ہو۔ اور وہ امر یا امور جو کسی سورہ میں مدِّنظر ہوتے ہیں اس سورہ کے مرکزی مضمون کے تحت ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر شانِ نزول معلوم کرنی ہو تو اس کو خود سورہ سے معلوم کرو...... جس طرح ایک ماہر طبیب دوا کے نسخہ سے اس شخص کی بیماری معلوم کر سکتا ہے جس کے لیے نسخہ لکھا گیا ہے اسی طرح تم ہر سورہ سے اس کی شانِ نزول معلوم کر سکتے ہو۔ اگر کلام میں کوئی موضوع پیش نظر ہے تو اس کلام اور اس موضوع میں وہی مناسبت ہوگی جو مناسبت لباس اور جسم میں بلکہ جلد اور بدن میں ہوتی ہے...... اور یہ جو روایتوں میں آتا ہے کہ فلاں فلاں آیتیں فلاں فلاں واقعات کے بارے میں نازل ہوئیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ سورہ کے نزول کے وقت یہ احوال و مسائل در پیش تھے۔ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں۔

"زرکشیؒ نے برہان میں لکھا ہے کہ صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کی یہ عام عادت ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ فلاں آیت فلاں بارے میں نازل ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ آیت اس حکم پر مشتمل ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بعینہٖ وہ بات اس آیت کے نزول کا سبب ہے۔ یہ گویا اس حکم پر اس آیت سے ایک قسم کا استدلال ہوتا ہے۔ اس سے مقصود نقلِ واقعہ نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ اسبابِ نزول میں ایک قابلِ لحاظ چیز یہ بھی ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ آیت اسی زمانے میں نازل ہوئی ہو جس زمانے میں واقعہ پیش آیا۔"

زرکشیؒ کے اس بیان سے وہ مشکل حل ہو جاتی ہے جس کا ذکر امام رازیؒ نے سورہ انعام کی تفسیر میں وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا الآیہ کے تحت کیا ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں۔

"مجھے یہاں ایک سخت اشکال پیش آیا ہے، وہ یہ کہ لوگ اس امر پر متفق ہیں کہ یہ پوری سورہ بیک دفعہ نازل ہوئی ہے۔ اگر صورت معاملہ یہ ہے تو پھر ہر آیت کے بارے میں یہ کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کا سببِ نزول فلاں واقعہ ہے۔"

پس ہمارے نزدیک، جیسا کہ اوپر کی تفصیل سے واضح ہوا، صورتِ معاملہ یہ ہے کہ جس وقت جو سورہ بھی نازل کی گئی ہے اس غرض سے نازل کی گئی ہے کہ جو معاملات محتاجِ توضیح و تشریح ہیں ان کی توضیح و تشریح کر دی جائے اور کلام ایسا ہو کہ اس کے نظم میں کسی قسم کا التباس و ابہام نہ ہو۔ جس طرح ایک ماہر اور حکیم خطیب اپنے سامنے کے خاص حالات و

مقتضیات کی بنا پر ایک خطبہ دیتا ہے کہ بسا اوقات وہ ایک خاص معاملے کا ذکر اگرچہ نظر انداز کر جاتا ہے لیکن اس کا کلام اس طرح کے تمام معاملات و احوال پر حاوی ہوتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ ذکر تو کسی خاص معاملے یا کسی خاص شخص کا کرتا ہے لیکن کلام ایک عالمگیر بارش کی طرح بالکل عام و ہمہ گیر ہوتا ہے، اسی طرح قرآن حکیم کا نزول بھی ہوا ہے...

پس اگر تم طمانیت اور یقین کے طالب ہو تو شان نزول کی پیروی میں سررشتۂ نظم کو ہرگز ہاتھ سے نہ دینا ورنہ تمہاری مثال صحرا کے اس مسافر کی مانند ہو جائے گی جو اندھیرے میں کسی چوراہے پر پہنچ گیا ہے اور نہیں جانتا کہ اب کدھر جائے۔ شانِ نزول خود قرآن کے اندر سے اخذ کرنی چاہیئے اور احادیث و آثار کے ذخیرے میں سے صرف وہ چیزیں لینی چاہئیں جو نظم قرآن کی موافقت کریں نہ کہ اس کے سارے نظم کو درہم برہم کر کے رکھ دیں۔"

میں نے شان نزول کے معاملے میں ٹھیک اسی طریقے کی پیروی کی ہے۔ واقعات کو صرف انھی آیات کی تفسیر میں اہمیت دی ہے جن میں کسی واقعہ کی تصریح یا تلمیح ہے اور ان کو بھی ان تمام غیر ضروری تفصیلات سے الگ کر کے لیا ہے جن کی تائید قرآن کے الفاظ یا اشارات سے نہیں ہوتی۔

## کتبِ تفسیر:

تفسیر کی کتابوں میں سے تین تفسیریں بالعموم میرے پیش نظر رہی ہیں۔ تفسیر ابن جریرؒ، تفسیر رازیؒ، تفسیر زمخشریؒ۔ اقوال سلف کا مجموعہ تفسیر ابن جریر ہے، متکلمین کی قیل و قال اور عقلی موشگافیاں تفسیر کبیر میں موجود ہیں، نحو و اعراب کے مسائل کشاف میں مل جاتے ہیں۔ یوں تو یہ تفسیریں میرے فکر و مطالعہ کی زندگی کے آغاز ہی سے میرے پیش نظر رہی ہیں لیکن لکھتے وقت خاص طور پر میں نے ان پر ایک نظر ضرور ڈال لی ہے۔ ان کے علاوہ جو تفسیر کی کتابیں ہیں ان کی طرف میں نے صرف اسی صورت میں رجوع کیا ہے جب کوئی ایسی اہم بات پیش آئی ہے جس کے لیے ہر اس گوشے کو ٹٹولنا پڑا ہے جہاں سے کسی رہنمائی کی امید ہوئی ہے۔ ان کتابوں سے میرے استفادے کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ میں نے کوئی بات مجرد ان کے اعتماد پر لکھ دی ہو بلکہ صرف وہی بات ان کی لی ہے جو ان اصولوں پر پوری اتری ہے جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ ہمارا طریقہ، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہ ہے کہ ہم ہر سورہ اور ہر آیت پر اس کے الفاظ، اس کے سیاق و سباق، اس کے نظم اور قرآن میں اس کے شواہد و نظائر کی روشنی میں غور کرتے ہیں۔ اس طرح جو باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں مزید اطمینان کے لیے ان کو تفسیروں میں بھی دیکھ لیتے ہیں۔ جس نتیجے تک ہم پہنچتے ہیں ان کی تائید اگر تفسیروں سے بھی ہو جاتی ہے تو اس سے مزید اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر تفسیروں سے اس کی تائید نہیں ہوتی تو اس پر غور و فکر جاری رکھتے ہیں تا آنکہ یا تو اپنی غلطی دلائل کے ساتھ واضح ہو جائے یا تفسیروں میں جو بات ہے اس کے ضعف کے وجوہ و دلائل سامنے آجائیں۔ ہمارے نزدیک تفسیروں سے فائدہ اٹھانے کا صحیح طریقہ یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں تفسیروں کے حوالے بہت زیادہ نہیں ملیں گے۔ صرف انھی مقامات میں ان کے حوالے میں نے دیے ہیں جہاں مسئلے کی اہمیت اس کی داعی ہوتی ہے یا قاری کے اطمینان کے نقطۂ نظر سے حوالے کی ضرورت و اہمیت

محسوس ہوئی ہے۔ اہم مقامات میں سے جہاں میں اپنی تائید میں کوئی حوالہ نہیں دے سکا ہوں وہاں اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں اتنے دلائل جمع کر دیئے ہیں جو انشاء اللہ اطمینان پیدا کرنے کے لیے کافی ہوں گے۔

## قدیم آسمانی صحیفے :

قرآن مجید میں جگہ جگہ قدیم آسمانی صحیفوں، تورات، زبور، انجیل کے حوالے ہیں۔ بہت سے مقامات پر انبیائے بنی اسرائیل کی سرگزشتیں ہیں۔ بعض جگہ یہود اور نصاریٰ کی تحریفات کی تردید اور ان کی پیش کردہ تاریخ پر تنقید ہے۔ اس طرح کے مواقع میں میں نے ان روایات پر اعتماد نہیں کیا ہے جو ہماری تفسیر کی کتابوں میں منقول ہیں۔ یہ روایات زیادہ تر سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں اس وجہ سے نہ تو یہ اہل کتاب پر حجت ہو سکتی ہیں اور نہ ان سے خود پڑھنے ہی دل کے اندر اطمینان پیدا ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر میں نے بحث و تنقید کی بنیاد اصل ماخذوں یعنی تورات و انجیل پر رکھی ہے۔ جس حد تک قرآن اور قدیم صحیفوں میں موافقت ہے وہ موافقت میں نے دکھا دی ہے اور جہاں فرق ہے وہاں قرآن کے بیان کی حجت و قوت واضح کر دی ہے۔ تفسیر کی پہلی جلد میں، بقرہ اور آل عمران دونوں کی تفسیر میں، ایسے بہت سے معرکے ملیں گے جن کو پڑھ کر قارئین یہ اندازہ کر سکیں گے کہ فی الواقع قرآن کا اصل زور اسی وقت واضح ہوتا ہے جب کسی معاملے میں اس کے بیان کو تورات و انجیل کے مقابل میں رکھ کے جانچا جائے۔

ان مقابل بحثوں کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس طرح قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے اسی طرح تورات، زبور اور انجیل بھی اللہ ہی کے اتارے ہوئے صحیفے ہیں۔ اگر ان کے بدقسمت حاملوں نے ان صحیفوں میں تحریفیں نہ کر دی ہوتیں تو یہ بھی اسی طرح ہمارے لیے رحمت و برکت تھے جس طرح قرآن ہے۔ لیکن ان تحریفات کے باوجود آج بھی ان کے اندر حکمت کے خزانے ہیں۔ اگر آدمی ان کو پڑھے تو یہ حقیقت آفتاب کی طرح سامنے آتی ہے کہ ان صحیفوں کا سرچشمہ بھی بلاشبہ وہی ہے جو قرآن کا ہے۔ میں ان کو بار بار پڑھنے کے بعد اس رائے کا اظہار کرتا ہوں کہ قرآن کی حکمت کے سمجھنے میں جو مدد ان صحیفوں سے ملتی ہے وہ مدد مشکل ہی سے کسی دوسری چیز سے ملتی ہے۔ خاص طور پر زبور، امثال اور انجیلوں کو پڑھیے تو ان کے اندر ایمان کو وہ غذا ملتی ہے جو قرآن و حدیث کے سوا اور کہیں بھی نہیں ملتی۔ حیرت ہوتی ہے کہ جن قوموں کے پاس یہ صحیفے موجود تھے وہ قرآن اور پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے کیوں محروم رہیں۔

## تاریخ عرب :

قرآن میں عرب کی پچھلی قوموں مثلاً عاد، ثمود، مدین اور قوم لوط وغیرہ کی تباہی کا ذکر ہے۔ ساتھ ہی ان کے معتقدات، ان کے انبیا کی دعوت اور اس دعوت پر ان کے ردعمل کی طرف اشارات ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی عرب میں آمد، ان کی قربانی، ان کی دعوت، ان کے ہاتھوں تعمیر بیت اللہ اور

ان کی برکت سے عرب کے اخلاقی، تمدنی، معاشرتی، معاشی حالات کی تبدیلی کا مختلف اسلوبوں سے بیان ہے۔ بعد میں قریش نے دینِ ابراہیمؑ کو جس طرح مسخ کیا اور بیت اللہ کو جو مرکزِ توحید تھا، جس طرح ایک بت خانہ بنایا اور اس کے نتیجے میں جو رسوم اور جو بدعتیں ظہور میں آئیں ان کے جگہ جگہ حوالے ہیں۔ ان ساری باتوں کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضرورت ہے کہ اس دور کی پوری تاریخ پر آدمی کی نظر ہو۔ لیکن بدقسمتی سے اس دور کی کوئی مستند تاریخ موجود نہیں۔ حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی تاریخ کا بھی وہ حصہ جو عرب میں ان کی آمد اور تعمیر بیت اللہ و قربانی وغیرہ سے متعلق تھا وہ، جیسا کہ تفسیر سورہ بقرہ میں معلوم ہوگا، یہود نے بالکل بدل ڈالا۔ مختلف کتابوں سے جو جستہ جستہ معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ اگرچہ مفید ہیں لیکن کافی نہیں۔ عرب کے شعرا اور خطبا کے کلام میں ظاہر ہے کہ اس طرح کی باتوں کی طرف صرف اشارات مل سکتے ہیں جو اگرچہ نہایت کارآمد ہیں تاہم ان کی حیثیت اشارات کی ہے۔ میں نے جہاں جہاں سے کچھ معلومات حاصل ہونے کی توقع پائی ہے وہاں پہنچنے کی کوشش کی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس کوشش سے مجھے بعض قیمتی معلومات حاصل ہوئی ہیں جن سے میں نے قرآن کے بعض اشارات کھولنے میں مدد لی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس باب میں مجھے اصلی اعتماد قرآن مجید ہی پر کرنا پڑا ہے۔ میں نے تاریخ کی روایات میں سے انھی باتوں کو لیا ہے جن کی تائید مجھے خود قرآن سے بھی حاصل ہو گئی ہے اور یہ جو کچھ بھی ہوا ہے سب اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی مدد سے ہوا ہے۔

## ۴۔ قرآن کے طالبوں کے لیے چند ہدایات

یہاں تک میں نے فہم قرآن کے جن خارجی و داخلی شرائط کا ذکر کیا ہے یہ سب باتیں علمی و فنی نوعیت کی ہیں۔ میں نے خود ان کو ملحوظ رکھا ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ انھیں ملحوظ رکھے بغیر کوئی شخص قرآن سے صحیح استفادہ نہیں کر سکتا لیکن ان کی حیثیت بہرحال وسائل کا اور اسلحہ کی ہے۔ جس طرح اسلحہ جنگ کے لیے ضروری ہیں اسی طرح یہ وسائل فہم قرآن کے لیے ناگزیر ہیں۔ مگر معلوم ہے کہ جنگ کے لیے صرف ہتھیار ہی کافی نہیں ہوتے بلکہ اس کی فتح و شکست میں اصلی عامل کی حیثیت دل کو حاصل ہے۔ اگر آدمی کے سینے میں مضبوط اور بہادر دل نہ ہو تو اس کو ہزار اسلحہ سے لیس کر دیجیے لیکن وہ کامیاب لڑائی نہیں لڑ سکتا۔

بر مخنث سلاحِ جنگ چہ سود!

اسی طرح فہم قرآن کے کام میں ان شرائط کی نگہداشت ہرچند ضروری ہے لیکن ان شرائط کی نگہداشت سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ آدمی اپنے دل کے رُخ کو صحیح رکھے۔ اگر دل کا رخ صحیح نہ ہو تو ہر چیز بالکل بے سود ہو کے رہ جاتی ہے۔ اب میں چند باتیں دل کے رُخ کو صحیح رکھنے کے لیے عرض کرتا ہوں۔

### نیت کی پاکیزگی:

اس کے لیے سب سے پہلی چیز نیت کی پاکیزگی ہے۔ نیت کی پاکیزگی سے میرا مطلب یہ ہے کہ آدمی قرآن مجید کو صرف طلب ہدایت کے لیے پڑھے، کسی اور غرض کو سامنے رکھ کے نہ پڑھے۔ اگر طلب ہدایت کے سوا آدمی کے سامنے کوئی اور غرض ہوگی تو وہ نہ صرف قرآن کے فیض ہی سے محروم رہے گا بلکہ اندیشہ اس بات کا بھی ہے کہ قرآن سے جتنا دور وہ اب تک رہا ہے اس سے بھی کچھ زیادہ دور ہٹ جائے۔ اگر آدمی قرآن پر اس لیے خامہ فرسائی کرے کہ لوگ اسے مفسر قرآن سمجھنے لگیں اور وہ کوئی تفسیر لکھ کر جلد سے جلد شہرت اور نفع حاصل کر سکے تو ممکن ہے اس کی یہ غرض حاصل ہو جائے لیکن قرآن کے علم سے وہ محروم ہی رہے گا۔ اسی طرح اگر آدمی کے کچھ اپنے نظریات ہوں اور وہ قرآن کی طرف اس لیے رجوع کرے کہ اس کے ان نظریات کے لیے قرآن سے کچھ دلائل ہاتھ آجائیں تو ممکن ہے وہ قرآن سے کچھ الٹی سیدھی دلیلیں گھڑنے میں کامیاب ہو جائے لیکن ساتھ ہی وہ اپنی اس حرکت کے سبب سے اپنے اوپر قرآن کا دروازہ بالکل بند کرلے گا۔

قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا صحیفہ بنا کر اتارا ہے اور ہر آدمی کے اندر طلب ہدایت کا داعیہ ودیعت فرمایا ہے۔ اگر اس داعیے کے تحت آدمی قرآن مجید کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ بقدر کوشش اور بقدر توفیق الٰہی اس سے فیض پاتا ہے۔ اور اگر اس داعیہ کے سوا کسی اور داعیہ کی تحریک سے، کسی حقیر مقصد کے لیے وہ قرآن کو استعمال کرنا چاہتا ہے تو "لِکُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰی" کے اصول کے مطابق وہ وہی چیز پاتا ہے جس کا وہ طالب ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی اسی خصوصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ "یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّیَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا" (اللہ اس کے ذریعہ سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے) اور اس کے بعد اس ہدایت و ضلالت کا ضابطہ بھی بیان فرما دیا ہے کہ وَمَا یُضِلُّ بِہٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ (اس کے ذریعے سے نہیں گمراہ کرتا مگر انھیں لوگوں کو جو نافرمان ہوتے ہیں) یعنی جو لوگ فطرت کی سیدھی راہ سے ہٹ کر چلتے ہیں اور ہدایت سے بھی ضلالت ہی حاصل کرنا چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو وہی چیز دیتا ہے جس کے وہ بھوکے ہوتے ہیں۔ اگر ایک شخص کعبہ جا کر بھی بتوں ہی کی پرستش کرنا چاہتا ہے تو وہ ہرگز اس بات کا سزاوار نہیں ہے کہ وہ توحید کی لذت سے آشنا ہو۔ اگر کوئی شخص پھولوں کے اندر سے بھی کانٹے ہی جمع کرنا چاہتا ہے تو وہ ہرگز اس کا مستحق نہیں ہے کہ اس کو پھولوں کی خوشبو نصیب ہو۔ جو شخص اپنے فساد طبیعت کے سبب سے علاج کو بھی بیماری بنا لیتا ہے وہ اسی لائق ہے کہ شفا حاصل ہونے کے بجائے اس کی بیماری ہی میں اضافہ ہو۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن حکیم نے ان لفظوں میں اشارہ فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالْھُدٰی فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُھُمْ وَمَا کَانُوْا مُھْتَدِیْنَ (بقرہ-۱۶) | یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو اختیار کیا تو ان کی یہ تجارت ان کے لیے نفع بخش نہ ہوئی اور وہ ہدایت پانے والے نہ بنے۔ |

## قرآن کو ایک برتر کلام مانا جائے:

دوسری چیز یہ ہے کہ قرآن مجید کو ایک اعلیٰ اور برتر کلام مان کر اس پر غور کرنے اور اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اگر دل میں قرآن مجید کی عظمت و اہمیت نہ ہو تو آدمی اس کے سمجھنے اور اس کے حقائق و معارف دریافت کرنے پر وہ محنت صرف نہیں کر سکتا جو اس کے خزائن حکمت سے مستفید ہونے کے لیے ضروری ہے۔ اگر کسی رقبہ وزمین کے متعلق یہ علم ہو کہ وہاں سے سونا نکلتا رہا ہے اور کسی زمانہ میں اس سے کافی سونا نکل چکا ہے تو توقع بھی کی جاتی ہے کہ اگر کھدائی کی جائے تو یہاں سے سونا ہی نکلے گا اور پھر اس کی اسی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر اس سے فائدہ اٹھانے کا سروسامان کیا جاتا ہے اور اس پر اسی اعتبار سے محنت کی جاتی ہے۔ لیکن ایک معدن کو اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ گھورا ہے یا یہ کہ اگر یہاں محنت صرف کی جائے تو زیادہ سے زیادہ یہاں سے کوئلہ یا چونا فراہم ہو سکے گا تو اس پر یا تو کوئی سرے سے اپنی محنت ضائع کرنا پسند ہی نہیں کرے گا اور اگر کرے گا تو صرف اس حد تک جس حد تک اس کو اس سے فائدہ پہنچنے کی توقع ہوگی۔

بظاہر یہ بات بعض لوگوں کو کچھ عجیب سی معلوم ہوگی کہ ایک کتاب کے متعلق اس کے سمجھنے سے پہلے ہی یہ حسن ظن قائم کر لیا جائے کہ وہ نہایت ہی عظیم اور برتر کتاب ہے لیکن غور کیجیے تو قرآن کے متعلق یہ پیشگی حسن ظن کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ قرآن مجید اپنے پیچھے ایک عظیم تاریخ رکھتا ہے۔ کوئی شخص اس کتاب پر ایمان رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو لیکن اس حقیقت سے وہ انکار نہیں کر سکتا کہ جتنا بڑا انقلاب دنیا میں اس کتاب نے برپا کیا ہے اتنا بڑا انقلاب کسی کتاب نے بھی نہیں برپا کیا۔ اس نے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک انسانی زندگی کے ہر گوشے کو نہایت گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔ اس نے لوگوں کے سوچنے کے انداز بدل ڈالے، افکار و نظریات بدل ڈالے، تہذیب و تمدن بدل ڈالے، آئین و قانون بدل ڈالے، مذاہب و ادیان بدل ڈالے۔ اتنی ہمہ گیر و عالم گیر تبدیلیاں لانے والی کتاب کسی شخص کے نزدیک اچھی بھی ہو سکتی ہے، بری بھی لیکن کسی کے نزدیک بھی غیر اہم نہیں ہو سکتی۔ ہر انسان جو زندگی کے مسائل پر غور کرتا ہے، ان کو بے پروائی کے ساتھ نظر انداز کرنے کا عادی نہیں ہے، وہ اس کتاب کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ یہ ضرور جاننا چاہے گا کہ اس کتاب کے اندر وہ کیا چیز چھپی ہوئی ہے جس کے ذریعے سے اس نے اس دنیا کی کایا پلٹ دی؟ وہ یہ ضرور سمجھنا چاہے گا کہ آخر اس میں وہ کیا جادو پوشیدہ ہے کہ عربوں کی قوم، جس کو اونٹ چرانے کے سوا اور کسی بات کا بھی سلیقہ نہ تھا، اس کو پڑھ کر دفعتاً شتربانی کے درجے سے ترقی کر کے جہاں بانی کے مرتبے پر پہنچ گئی؟ وہ یہ ضرور معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ آخر اس کے اندر وہ کیا حکمت کا خزانہ بند ہے کہ جو قوم زیادہ سے زیادہ امرؤ القیس اور زہیر کے درجے کے آدمی مشکل سے پیدا کرتی تھی اس کے اندر ابوبکرؓ صدیقؓ اور عمرؓ کے مرتبے کے لوگ پیدا ہونے لگے؟

پھر یہ بات بھی ہے کہ دنیا کی آبادی کا ایک عظیم حصہ اس کو صرف ایک کتاب ہی نہیں مانتا بلکہ آسمانی اور خدائی کتاب اور لوح محفوظ سے اترا ہوا کلام مانتا ہے، اس کو ایک ایسا معجز کلام مانتا ہے جس کی نظیر نہ انسان پیش کر سکتے، نہ جنات۔ ایک ایسا کلام جس کے ماضی و حاضر کے متعلق یہ احساسات اور یہ شہادتیں موجود ہوں بہر حال ایک

اہمیت رکھنے والا کلام ہے اور آدمی اس کو سمجھنے کا صحیح حق اسی صورت میں ادا کر سکتا ہے جب وہ اس کی اسی عظمت و اہمیت کو سامنے رکھ کر اس پر غور کرے۔ اگر یہ اہمیت اس کے سامنے نہ ہو تو ممکن ہے کہ آدمی کا ذہن اس کو اس اہتمام کا مستحق نہ سمجھے جس کا وہ فی الواقع مستحق ہے۔

یہ تنبیہ ہیں تے اس لیے ضروری سمجھی ہے کہ اس زمانے میں لوگوں کے اندر قرآن مجید کے متعلق ایسی غلط فہمیاں موجود ہیں جن کے ہوتے ہوئے ممکن نہیں ہے کہ اس کو اس اعتنا و اہتمام کا مستحق سمجھا جائے جو اس سے حقیقی استفادے کے لیے ضروری ہے۔ یہ غلط فہمیاں قرآن کے ماننے والوں اور اس کے منکروں، دونوں کے اندر موجود ہیں۔

جو اس کے منکر ہیں وہ اس بات کا تو ایک حد تک اعتراف کرتے ہیں کہ ایک خاص دور میں اس کتاب کے ذریعے سے کچھ اصلاحات واقع ہوئیں۔ لیکن ان کے خیال میں اب وہ زمانہ گزر چکا۔ عرب کے بدوؤں کے لیے جن کے مسائل سیدھے سادے تھے، یہ کتاب مفید ہو سکتی تھی، لیکن موجودہ زمانے کے اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کے لیے یہ کتاب کافی نہیں۔

جو اس کے ماننے والے ہیں ان میں سے بہت سے لوگ اسے محض حرام و حلال کے بتانے کا ایک فقہی ضابطہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ فقہ کے احکام علیحدہ مرتب ہو جانے کے بعد ان کی نگاہوں میں اگر اس کی کوئی اہمیت باقی رہ گئی ہے تو صرف تبرک کے نقطۂ نظر سے باقی رہ گئی ہے۔ بہت سے لوگ اس کو بس متبرک کلمات اور دعاؤں کا مجموعہ سمجھتے ہیں جن کا ورد تو ضروری ہے لیکن وہ اس کو غور و فکر کا محل نہیں سمجھتے۔ بہت سے لوگ اس کو نزع کی سختیوں کو دور کرنے یا ایصالِ ثواب کی کتاب سمجھتے ہیں اور جب بھی وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اسی قسم کی غرض کے لیے متوجہ ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس کو دفع آفات و بلیات کا تعویذ سمجھتے ہیں اور ان کی ساری دلچسپی اس کے ساتھ بس اسی پہلو سے ہوتی ہے —
اس طرح کی غلط فہمیوں میں پڑے ہوئے مسلمان نا ممکن ہے کہ قرآن حکیم سے وہ فائدہ اٹھا سکیں جس کے لیے فی الحقیقت وہ نازل ہوا ہے۔ ان لوگوں کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ان کو ایک توپ دی گئی کہ وہ اس کے ذریعے سے شیطان کے قلعے مسمار کریں لیکن وہ اس کو مچھر مارنے کی مشین سمجھ بیٹھے۔

## قرآن کے تقاضوں کے مطابق بدلنے کا عزم :

قرآن حکیم سے صحیح استفادے کے لیے تیسری ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی کے اندر، قرآن مجید کے تقاضوں کے مطابق، اپنے ظاہر و باطن کو بدلنے کا مضبوط ارادہ موجود ہو۔ ایک شخص جب قرآن مجید کو گہری نگاہ سے پڑھتا ہے۔ تو وہ ہر قدم پر یہ محسوس کرتا ہے کہ قرآن کے تقاضے اور مطالبے اس کی اپنی خواہشوں اور چاہتوں سے بالکل مختلف ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے تصورات و نظریات بھی قرآن سے بیشتر الگ ہیں اور اس کے معاملات و تعلقات بھی قرآن کے مقرر کردہ حدود سے ہٹے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے باطن کو بھی قرآن سے دور پاتا ہے اور اپنے ظاہر کو بھی اس سے بالکل منحرف دیکھتا ہے۔ اس فرق و اختلاف کو محسوس کر کے ایک

صاحب عزم اور حق طلب آدمی تو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ خواہ کچھ ہو میں اپنے آپ کو تاحدِ امکان قرآن کے مطالبات کے مطابق بنانے کی کوشش کروں گا۔ وہ ہر قسم کی قربانیاں کر کے، ہر طرح کے مصائب جھیل کر، ہر نوع کی ناگواریاں برداشت کر کے اپنے آپ کو قرآن کے مطابق بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی نیت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی توفیق پاتا ہے۔ لیکن جو شخص صاحبِ عزم نہیں ہوتا ہے وہ اس خلیج کو پاٹنے کی ہمت نہیں کرتا جو وہ اپنے اور قرآن کے درمیان حائل پاتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر میں اپنے عقائد و تصورات کو قرآن کے مطابق بنانے کی کوشش کروں تو مجھے ذہنی اور فکری اعتبار سے نیا جنم لینا پڑے گا۔ اسے یہ نظر آتا ہے کہ اگر میں اپنے اعمال و اخلاق کو قرآن کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کروں تو میرا اپنا ماحول میرے لیے بالکل اجنبی بن کے رہ جائے گا۔ اسے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر میں اپنے آپ کو ان مقاصد کی تکمیل میں سرگرم کروں جن کا مطالبہ مجھ سے قرآن کر رہا ہے تو میں جن فوائد اور جن لذات سے متمتع ہو رہا ہوں ان سے متمتع ہونا تو الگ رہا، عجب نہیں کہ جیل اور پھانسی کی سزاؤں سے دوچار ہونا پڑے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ اگر میں اپنے وسائل معاش کو قرآن کے ضابطۂ حرام و حلال کی کسوٹی پر پرکھوں تو آج جو عیش مجھے حاصل ہے اس سے محروم ہو کر شاید اپنی نانِ شبینہ کے لیے بھی فکر مند ہونا پڑے۔ ان خطروں کے مقابل ڈٹ جانا اور ان سے مقابلے کے لیے کمر ہمت باندھ لینا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ صرف مردانِ کار ہی ان گھاٹیوں کو پار کر سکتے ہیں مگر ورا ارادے اور پست حوصلے کے لوگ یہیں سے اپنے رخ بدل لیتے ہیں۔ بعض، جو اپنی کمزوریوں پر زیادہ پردہ ڈالنے کے خواہشمند نہیں ہوتے، وہ تو یہ کہتے ہوئے اپنی خواہشوں کے پیچھے چل کھڑے ہوتے ہیں کہ قرآن مجید کا راستہ ہے تو بالکل صحیح لیکن اس پر ہمارے لیے چلنا نہایت مشکل ہے اس لیے ہم اسی راستے پر چلتے رہیں گے جس پر چلتے آئے ہیں۔ لیکن جو لوگ اپنی کمزوریوں کو عزیمت اور اپنے نفاق کو ایمان کے روپ میں پیش کرنے کا شوق رکھتے ہیں، وہ اپنا یہ شوق مختلف تدبیروں سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض اضطرار و مجبوری کے بہانوں سے اپنے لیے ناجائز کو جائز اور حرام کو حلال بناتے ہیں۔ بعض جھوٹی اور باطل تاویلات کے ذریعے سے باطل پر حق کا ملمع چڑھاتے ہیں۔ بعض وقت کے مصالح اور حکمت عملی کے تقاضوں کی آڑ تلاش کرتے ہیں۔ بعض کتاب الٰہی میں اس قسم کی تحریفیں کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس قسم کی تحریفوں کے مرتکب یہود اور نصاریٰ ہوئے ہیں۔ بعض کفر و ایمان کے بیچ سے ایک راہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، قرآن کے جس حصے کو اپنی خواہشوں کے مطابق پاتے ہیں اس کو تو لے لیتے ہیں اور جس حصے کو اپنی خواہشوں کے مطابق نہیں پاتے اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

یہ ساری راہیں شیطان کی نکالی ہوئی ہیں۔ ان میں سے جس راہ کو بھی آدمی اختیار کرے گا وہ اس کو سیدھا ہلاکت کے گڑھے کی طرف لے جائے گی۔ کامیابی اور فلاح کی راہ صرف یہ ہے کہ آدمی قرآن کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی ہمت کرے اور اس کے لیے ہر قربانی پر آمادہ ہو جائے۔ کچھ عرصے تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اس ارادے کی آزمائش ہوتی ہے۔ اگر آدمی اس آزمائش میں اپنے آپ کو مضبوط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر اس کے لیے کامرانی کی راہیں کھلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو خدا

اس کے لیے دوسرا دروازہ کھول دیتا ہے۔ اگر ایک ماحول سے وہ پھینکا جاتا ہے تو دوسرا ماحول اس کے خیر مقدم کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ اگر ایک زمین اس کو پناہ دینے سے انکار کر دیتی ہے تو دوسری سرزمین اس کے لیے اپنی آغوش کھول دیتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن حکیم نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۔
(عنکبوت - ۶۹)

اور جو ہماری راہ میں جد و جہد کریں گے ہم ضرور ان پر اپنی راہیں کھولیں گے اور اللہ خوب کاروں کے ساتھ ہے۔

## تدبّر :

قرآن حکیم سے استفادے کے لیے چوتھی شرط تدبّر ہے۔ اس شرط کا ذکر خود قرآن مجید نے بار بار کیا ہے۔ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں) صحابہ رضی اللہ عنہم جو قرآن کے مخاطب اوّل تھے وہ قرآن کو برابر تدبّر کے ساتھ پڑھتے تھے اور جو لوگ جتنا ہی تدبّر کرتے تھے وہ اتنے ہی قرآن کے فہم میں ممتاز تھے۔ بعض صحابہؓ نے خود اپنے بارے میں یہ شہادت دی ہے کہ انھوں نے سورۂ بقرہ پر پورے آٹھ سال صرف کیے۔ صحابہؓ نے قرآن مجید کے مطالعے کے لیے حلقے بھی قائم کیے تھے جن میں اہل ذوق حضرات اکٹھے ہو کر اجتماعی مطالعہ کرتے تھے تاکہ ایک دوسرے کے فکر و تدبّر سے استفادہ کر سکیں۔ اس طرح کے قرآنی حلقوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص دلچسپی تھی اور روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ ذکر کے ان حلقوں کو ذکر کے حلقوں پر بھی ترجیح دیتے تھے۔ بعد میں خلفائے راشدین، خصوصاً حضرت عمرؓ، اس قسم کے حلقوں اور قرآن مجید کے ماہرین سے نہایت گہری دلچسپی لیتے رہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی حوصلہ افزائی جن جن طریقوں سے حضرت عمرؓ نے فرمائی ہے اس کو بیان کروں تو ایک مستقل داستان بن جائے[1]۔

محض تبرک کے طور پر الفاظ کی تلاوت کر لینا اور معانی کی طرف دھیان نہ کرنا حضرات صحابہؓ کا طریقہ نہیں ہے۔ یہ طریقہ تو اس وقت سے رائج ہوا ہے جب لوگوں نے قرآن مجید کو ایک صحیفۂ ہدایت کے بجائے محض حصول برکت کی ایک کتاب سمجھنا شروع کر دیا۔ جب زندگی کے مسائل سے قرآن عظیم کا تعلق صرف اس قدر رہ گیا کہ دم نزع اس کے ذریعے سے جان کنی کی سختیوں کو آسان کیا جائے اور مرنے کے بعد اس کے ذریعے سے میّت کو ایصال ثواب کیا جائے۔ جب زندگی کے نشیب و فراز میں رہنما ہونے کے بجائے اس کا مصرف صرف یہ رہ گیا کہ ہم جس ضلالت کا بھی ارتکاب کریں اس کا افتتاح اس کے ذریعے سے کریں تاکہ [illegible] اس ضلالت کو ہدایت بنا دیا کرے۔ جب لوگوں نے اس کو ایک

---

[1] جن لوگوں کو ان باتوں کے حوالے مطلوب ہوں وہ میری کتاب مبادی تدبّر قرآن دیکھیں۔ اس کے علاوہ حضرت ابن عباسؓ پر بھی میرا ایک مضمون ملاحظہ ہو میثاق جلد نمبر ۲، عدد ۱، ۲۔ مضمون بعنوان عہد صحابہؓ کے سب سے کم سن مفسّر قرآن ہے جس میں میں نے دکھایا ہے کہ حضرت عمرؓ نے قرآن کے تدبّر کے سلسلے میں کس کس طرح ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

تعویذ کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا تاکہ جب وہ اپنے دنیوی مقاصد کی تکمیل کے لیے نکلا کریں تو قرآن ان کی حفاظت کرے کہ اس راہ میں ان کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔

دنیا کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس نے قرآن حکیم سے زیادہ اس بات پر زور دیا ہو کہ اس کا حقیقی فائدہ صرف اسی صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے جب اس کو پورے غور و تدبر کے ساتھ پڑھا جائے لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ یہی ایک کتاب ہے جو ہمیشہ آنکھ بند کر کے پڑھی جاتی ہے۔ معولی سے معولی کتاب بھی پڑھنے کے لیے لوگ کھولتے ہیں تو اس کے لیے سب سے پہلے اپنے دماغ کو حاضر کرتے ہیں لیکن قرآن کے ساتھ لوگوں کی یہ انوکھی روش ہے کہ جب اس کو پڑھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو بالعموم سب سے پہلے اپنے دماغ پر پٹی باندھ لیتے ہیں۔

## اللہ تعالیٰ سے رہنمائی کی دعا:

قرآن مجید سے فائدہ اٹھانے کے لیے پانچویں شرط یہ ہے کہ اس کی مشکلات میں آدمی بددل اور مایوس ہونے یا قرآن مجید سے بدگمان یا اس پر معترض ہونے کے بجائے اپنی الجھن کو اپنے رب کے سامنے پیش کرے اور اسی سے مدد اور رہنمائی کا طلبگار رہو۔ قرآن میں تدبر کرنے والا کبھی کبھی ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے "قول ثقیل" کے نیچے دب گیا ہے جس کو اٹھانا اس کے لیے ناممکن ہو رہا ہے۔ اسی طرح وہ کبھی کبھی ایسا محسوس کرتا ہے کہ اس کے سامنے کوئی ایسی مشکل آ گئی ہے جس کی کوئی ایسی تاویل ممکن ہی نہیں ہے جس پر دل کو اطمینان ہو سکے۔ اس طرح کی عملی اور فکری مشکلوں اور الجھنوں سے نکلنے کا صحیح اور آزمودہ راستہ یہ ہے کہ آدمی اپنی جدوجہد کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے مدد اور رہنمائی کے لیے دعا بھی کرتا رہے۔ شب کے پچھلے پہر میں ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھنا بھی اس مقصد کے لیے خاص چیز ہے۔ جہاں تک حکمت کا تعلق ہے اس کے دروازے تو آخر شب کی خلوتوں کے بغیر کھلتے ہی نہیں۔ مندرجہ ذیل دعا بھی اکثر پڑھتے رہنا چاہیئے۔

| | |
|---|---|
| اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ عَبْدُكَ، ابْنُ عَبْدِكَ، ابْنُ اَمَتِكَ نَاصِيَتِیْ بِيَدِكَ، مَاضٍ فِیَّ حُكْمُكَ، عَدْلٌ فِیَّ قَضَاؤُكَ اَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ، سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ كِتَابِكَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِيْعَ قَلْبِیْ وَنُوْرَ صَدْرِیْ وَجِلَاءَ حُزْنِیْ وَذِهَابَ هَمِّیْ وَغَمِّیْ۔ | اے اللہ میں تیرا غلام، تیرے غلام کا بیٹا اور تیری لونڈی کا بیٹا ہوں۔ میری پیشانی تیری مٹھی میں ہے۔ مجھ پر تیرا حکم جاری ہے۔ میرے بارے میں تیرا فیصلہ حق ہے۔ میں تجھ سے تیرے ہر اس نام کے واسطے سے جو تیرا ہے جس سے تو نے اپنے کو پکارا ہے یا جس کو تو نے اپنی کتاب میں اتارا ہے یا جس کو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے، یہ درخواست کرتا ہوں کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینے کا نور، میرے غم کا مداوا اور میرے فکر و پریشانی کا علاج بنا دے۔ |

# ۵۔ چند حرف خاص اس تفسیر سے متعلق

آخر میں چند باتیں خاص اس کتاب سے متعلق بھی عرض کرنی ہیں۔

میں بلا کسی شائبہ فخر کے محض بیان واقعہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ یہ کتاب میری چالیس سال کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ میں نے اپنی جوانی کا بہترین زمانہ اس کتاب کی تیاریوں میں بسر کیا ہے اور اب اپنے بڑھاپے کی ناتوانیوں کا دور اسی کی تحریر و تسوید میں بسر کر رہا ہوں۔ اس طویل مدت میں میں نے زندگی کے بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں اور بہت سے تلخ و شیریں گھونٹ حلق سے اتارے ہیں لیکن اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ کسی دور اور کسی حال میں بھی میرا ذہنی و قلبی تعلق اس کتاب سے منقطع نہیں ہوا۔ میں نے اس ساری مدت میں جو کچھ پڑھا ہے اسی کو محور بنا کر پڑھا ہے جو کچھ سوچا ہے اسی کو سامنے رکھ کر سوچا ہے اور جو کچھ لکھا ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی سے متعلق لکھا ہے۔ میں نے قرآن حکیم کی ایک ایک سورہ پر ڈیرے ڈالے ہیں، ایک ایک آیت پر فکری مراقبہ کیا ہے اور ایک ایک لفظ اور ایک ایک ادبی یا نحوی اشکال کے حل کے لیے ہر اس پتھر کے اٹھنے کی کوشش کی ہے جس کے نیچے مجھے کسی سراغ کے ملنے کی توقع ہوئی ہے اور یہ راز بھی میں برملا ظاہر کرتا ہوں کہ میں نے کبھی بھی اس کام میں کوئی تکان یا افسردگی محسوس نہیں کی بلکہ ہمیشہ نہایت گہری لذت اور نہایت عمیق راحت کا احساس کیا ہے۔

ہر زماں از غیب جانے دیگر است

میری چالیس سال کی محنتوں کے نتائج کے ساتھ ساتھ اس میں میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی ۳۰۔۳۵ سال کی کوششوں کے ثمرات بھی ہیں۔ مجھے بڑا فخر ہوتا اگر میں یہ دعویٰ کر سکتا کہ اس کتاب میں جو کچھ بھی ہے سب استاذ مرحوم ہی کا افادہ ہے اس لیے کہ اصل حقیقت یہی ہے۔ لیکن میں یہ دعوےٰ کرنے میں صرف اس لیے احتیاط کرتا ہوں کہ مبادا میری کوئی غلطی ان کی طرف منسوب ہو جائے۔ مولانا سے میرے استفادے کی شکل یہ نہیں رہی ہے کہ ہر آیت سے متعلق یقین کے ساتھ ان کی رائے میرے علم میں آ گئی ہو، بلکہ میں نے ان سے قرآن حکیم پر غور کرنے کے اصول سیکھے ہیں اور خود ان کی رہنمائی میں پورے پانچ سال ان اصولوں کا تجربہ کرنے میں بسر کیے ہیں۔ پھر انھی اصولوں کو سامنے رکھ کر آج تک کام کرتا رہا ہوں۔ اس اعتبار سے اگرچہ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ یہ سب کچھ استاذ ہی کا فیض ہے لیکن اس میں چونکہ بلاواسطہ افادے کے ساتھ ساتھ بالواسطہ افادے کا بھی بہت بڑا حصہ ہے اس وجہ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ اس کا جو حصہ مستحکم اور مدلل نظر آئے اس کو استاذ مرحوم کا صدقہ سمجھیے اور جو بات کمزور یا غلط نظر آئے اس کو میری کم علمی پر محمول فرمائیے۔

اختصار کے خیال سے میں نے اس کتاب میں ہر آیت کے تحت صرف اسی حد تک بحث کی ہے جس حد تک اس کا اصل مدعا واضح کرنے کے لیے مناسب خیال کی ہے۔ آیت سے متعلق دوسرے ضمنی مباحث میں پڑنے سے بالارادہ احتراز کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت کا صحیح مفہوم سمجھ لینے کے بعد ایک ذہین قاری اس کے متعلقات کو خود اخذ کر سکتا ہے۔ جب تک ایک کلام کا موقع و محل متعین نہیں ہوتا اس وقت تک اس میں بڑے اختلاف کی گنجائش ہوتی

ہے۔ ہر ٹکڑے کے دسیوں بیسیوں مفہوم نکل سکتے ہیں، اس کے سبب سے اجتہاد واستنباط کا کام نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے لیکن موقع ومحل کے متعین ہو جانے کے بعد راہ نہایت مختصر ہو جاتی ہے۔ ہر آیت اپنے ابتدائی مفہوم کے ساتھ ساتھ اپنے لوازم بعیدہ کی طرف خود انگلی اٹھا کر اشارہ کرتی ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن بیدار ہو اور یہ شرط ایک ایسی شرط ہے جو ہر علمی کتاب سے استفادے کے لیے ناگزیر ہے، چہ جائیکہ ایک تفسیر کی کتاب۔

اس کتاب میں دوسری تفسیروں کے حوالے زیادہ نہیں ملیں گے اس کی وجہ، جیسا کہ اوپر اصولی مباحث کے ضمن میں عرض کر چکا ہوں، یہ ہے کہ اس کی بنیاد مروجہ طریقۂ تفسیر کی طرح تفسیر کی کتابوں پر نہیں ہے بلکہ براہ راست فہم قرآن کے اصلی وسائل و ذرائع پر ہے تاہم خاص خاص اہم مباحث میں ان تفسیروں اور ان ارباب تاویل کے حوالے بھی میں نے دیے ہیں جن کی تائید مجھے حاصل ہو سکی ہے۔ ان مواقع کے سوا بھی اگر میں چاہتا تو مجھے اپنی تائید میں حوالے مل جاتے لیکن میں نے اس کی زیادہ کوشش اس وجہ سے نہیں کی کہ میں چاہتا ہوں کہ ہر بات کو لوگ اس کے اساسی دلائل کی کسوٹی پر کس کر قبول کریں یا رد کریں۔

کتاب کو ثقالت سے بچانے کے لیے کلام عرب کے حوالے بھی میں نے زیادہ نہیں دیے ہیں۔ صرف بقدر کفایت ہی دیے ہیں۔ یہ کتاب اردو میں ہے اور اس کے پڑھنے والوں کی غالب تعداد ایسے ہی لوگوں پر مشتمل ہو گی جو عربی سے ناواقف ہوں گے۔ ایسے لوگوں کے لیے شعر عرب کے حوالے نامانوس بھی ہوں گے اور غیر مفید بھی۔ اس کمی کی تلافی میں نے قرآن مجید کے نظائر و شواہد سے اچھی طرح کر دی ہے اور یہ بات اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے سب سے زیادہ قابل اطمینان تفسیر ہے۔ تاہم یہ بات نہیں ہے کہ کلام عرب کو میں نے بالکل ہی نظر انداز کیا ہو، اہم ادبی اور نحوی اشکالات کے مواقع میں اس سے بھی میں نے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور اس کے حوالے بھی نقل کیے ہیں۔

میں اپنے رب کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے اس کتاب میں کسی ایک آیت کی بھی ایسی تفسیر نہیں کی ہے جس میں مجھے کوئی تردد ہو۔ جہاں ذرا بھی کوئی تردد ہوا ہے میں نے بے تکلف اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی عرض کرتا ہوں کہ کسی ایک مقام میں بھی میں نے یہ کوشش نہیں کی ہے کہ کسی آیت کو اس کے حقیقی مفہوم سے ہٹا کر اپنے کسی نظریے یا کسی خیال کی تائید کے لیے استعمال کروں۔ قرآن سے باہر کی کسی چیز سے بھی کبھی میری کوئی خاص قلبی و ذہنی وابستگی نہیں ہوئی۔ اگر ہوئی ہے تو قرآن ہی کے لیے اور قرآن ہی کے تحت ہوئی ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے والے محسوس کریں گے کہ جہاں کہیں مجھے اپنے استاذؒ سے بھی اختلاف ہوا ہے میں نے بے جھجک اس کا بھی اظہار کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب عزیز کی ایک نہایت ہی حقیر خدمت کی حیثیت سے اسے اس کے قدر دانوں کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس وقت میرے دل میں جو جذبات ہیں ان کی تعبیر سے میرا قلم قاصر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ناچیز خدمت کو قبول فرمائے، لغزشوں اور کوتاہیوں کو معاف فرمائے، اللہ کے بندوں اور بندیوں کو اس سے نفع پہنچے اور آخرت میں یہ میری نجات کا ذریعہ بنے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔